پیش لفظ

یہ کتاب ان سلسلہ ہائے مضامین کی ایک کڑی ہے جو گیارہ ستمبر کے بعد مختلف اوقات میں املا کرائے گئے ہیں۔ زندہ قومیں اپنے خلاّقی رویے اور نصرت الٰہی کے سہارے سنگین بحران کو بھی حیرت انگیز امکانات میں بدل سکتی ہیں۔

اب تک مسلم اہل فکر عظمتِ رفتہ کی بازیابی کا محض نعرہ بلند کرتے رہے ہیں۔ گزرے وقتوں کو اس طرح یاد کرنا کہ قومیں اس نیم رومانی ماحول کی اسیر ہوجائیں، یہ رویہ نہ صرف یہ کہ انہیں حال سے فرار پر مجبور کرتا ہے بلکہ ان کے دل ودماغ میں مستقبل کے سلسلے میں موہوم اندیشوں کو بھی جنم دیتا ہے۔ ماضی اگر حال کے جائزے پر آمادہ نہ کرے اور اس سے مستقبل کو بہتر بنانے کا حوصلہ نہ ملے تو قومیں ماضی کی اسیر ہوجاتی ہیں اور ایسی قوموں کو معاصر دنیا میں اپنے لئے کوئی مفید رول دکھائی نہیں دیتا۔ بدقسمتی سے ہم مسلمان ماضی کا اسی نیم رومانی انداز سے تذکرہ کرنے کے عادی ہوگئے ہیں۔

''مستقبل کی بازیافت'' میں ان عوامل کی نشاندہی کی کوشش کی گئی ہے جن کے ذریعے آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین ایک بار پھر دنیا کی سیادت پر فائز ہوسکتے ہیں۔ وہ بات جس کی طرف ہم دعوت دے رہے ہیں کوئی نیا نسخہ نہیں بلکہ کتاب و سنت کی طرف واپسی کی وہی دعوت ہے جو گزشتہ صدیوں میں بھی مسلم اہل فکر کی طرف سے دی جاتی رہی ہے البتہ اب تک کتاب و سنت کی طرف واپسی کی تحریکیں اگر اپنے مقاصد میں ناکام رہیں تو اس کی وجہ یہ تھی کہ خود اس صدائے انقلاب کے بلند کرنے والوں پر واپسی کے اسرار وعواقب واضح نہیں تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تمام حضرات کتاب کی طرف واپسی کے نام پر اپنے اپنے فقہی خیموں کے استحکام کی دعوت دیتے رہے۔ انسانوں کی تشریح وتعبیر سے ماوراء، متقدمین کی زمانی اور مکانی فہم وبصیرت سے پرے، وحی ربانی سے راست اکتساب ہمارے لئے ممکن نہ ہوسکا۔ معاصر تاریخ میں ایسے مفکرین کی کمی نہیں جو زندگی بھر قرآن مجید کے علمی مطالعہ میں مشغول رہے بلکہ جاتے جاتے انہوں نے ضخیم مجلدات پر مشتمل تفسیروں کا انبار بھی چھوڑا لیکن اس کے باوجود وہ آخری لمحہ تک حنفی یا شافعی بنے رہے۔ بھلا جب چالیس پچاس سال کا قرآنی مطالعہ بھی ہمیں قرآن مجید سے راست اکتساب پر آمادہ نہ کرسکے اور ہم خود کو اس بات پر مجبور پائیں کہ اپنی عملی زندگی میں فقہائے متقدمین کی فہم وبصیرت کی تقلید کریں اور ان سے سرِمو انحراف کو نقیض ایمان جانیں تو پھر نصف صدی کے قرآنی مطالعہ کو محض علمی تفنن وطبع کے علاوہ اور کیا کہا جاسکے گا۔ اس بات پر ایمان

کے باوجود کہ قرآن مجید خدا کی آخری کتاب ہے اور دین کی تکمیل عہد رسالت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں ہوگئی، آخر کیا وجہ ہے کہ بعد کی صدیوں میں آنے والے علماء ومفکرین کو ہم نے اساطینِ دین قرار دے رکھا ہے اور ہم میں سے بعض تو یہاں تک سمجھ بیٹھے ہیں کہ ائمہ اربعہ کا ظہور من جانب اللہ تھا جن کے فہمِ دین سے اختلاف ہمارے ایمان کے لئے سمِ قاتل ہوگا۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ اپنی تمام تر جلالت علمی اور ورع وتقویٰ کے باوجود اسلام کے یہ مایہ ناز سپوت ہماری ہی طرح انسان تھے جن سے فکری التباسات کا صدور عین ممکن تھا۔ اگر ہم واقعی کتاب وسنت کی طرف واپسی میں سنجیدہ ہیں تو ہمیں صدیوں پر مشتمل ان تعبیری اور تفسیری ادب کو عبور کرنے کا حوصلہ پیدا کرنا ہوگا جبھی یہ ممکن ہے کہ وحی کی تجلیوں سے ہماری راہیں اسی طرح منور ہوجائیں جس طرح عہد رسول میں ہوئی تھیں۔

ایک ایسی امت جو نبی آخرؐ اور آپؐ کے متبعین کی قیادت میں محض پچاس ساٹھ سال کے مختصر عرصے میں چہار سمت کچھ اس طرح چھائی جاتی تھی، جس پر آج بھی مورخین انگشت بدنداں ہیں، آخر کیا وجہ ہے کہ وہ صدیوں سے زوال پذیر ہے۔ ہمارے مصلحین اتحاد امت کی کوششوں میں بری طرح ناکام ہیں۔ ہمارے لئے یہ تو ممکن ہے کہ ہم جابر سے جابر دشمنوں کو شکست دے سکیں لیکن جب ایک متبادل نظام کے قیام کا مسئلہ سامنے آتا ہے تو ہماری تلواریں آپس میں الجھ کر رہ جاتی ہیں۔ ہم میں سے ہر گروہ اپنے فرقے کا اسلام قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس سے مزید چشم پوشی کرنا میرے نزدیک جرم عظیم ہے، کتمان حق ہے۔ لازم ہے کہ اس فکری انتشار کا فی الفور علاج کیا جائے اور یہ تب ہی ممکن ہے جب ہم تفرقہ کی اصل بنیادوں پر تیشہ چلانے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔

یہ مضامین چونکہ مختلف اوقات میں املا کرائے گئے ہیں اس لئے ان میں بعض خیالات کی تکرار شاید کہیں کہیں گراں معلوم ہو۔ یا ممکن ہے اس تکرار سے ان باتوں کو ذہن نشین کرانے میں مدد ملے جو اس کتاب کا ہدف ہیں۔ ان تحریروں کو علمی حوالوں سے بوجھل نہیں کیا گیا ہے تاکہ عام قاری کی دلچسپی برقرار رہے۔ ہوسکتا ہے بعض بیانات مزید دلائل اور دستاویزی ثبوت چاہتے ہوں، میں نے ایسے تمام دلائل اپنی دراز میں محفوظ کر رکھے ہیں تاکہ مستقبل میں سوال قائم کرنے والوں کی تشفی کی جاسکے اور اس لئے بھی کہ اس خیال کی مزید تشریح وتعبیر میری پیش آمدہ تحریروں میں مل سکے۔

خدا کرے اس مختصر کتاب کی اشاعت سے ان عناصر کی دریافت میں مدد ملے جو قرنِ اول کے مسلمانوں کو اقوامِ عالم کی سیادت پر فائز کرنے کا سبب بنے تھے۔ آمین!

راشد شاز

۱۱ر ستمبر ۲۰۰۵ء

نئی دہلی۔۲۵

دین کی طرف ہماری واپسی بڑی حد تک فقہی رسوم کی بازیافت سے عبارت رہی۔ وحی ربانی پر انسانی تعبیرات نے التباسات کی جو دبیز دھند طاری کر رکھی تھی اس کے اسرار و عواقب کا صحیح اندازہ لگانے میں ہم سے سخت غلطی ہوتی رہی۔ آخری وحی کے حاملین کی حیثیت سے ہم اس بات کے سزاوار ہیں کہ دنیائے انسانیت کو راہ یاب کرنے کے لیے ہر ممکن قدم اٹھائیں لیکن ایسا تب ہی ممکن ہے جب خود ہمارا فکری اور عملی وجود راست وحی ربانی سے غذا حاصل کرتا ہو۔

ایک نئی ابتداء کا اہتمام

فی زمانہ امت مسلمہ ایک بڑے بحران سے دوچار ہے۔ باشعور اور فکرمند مسلمان خود اپنے آپ سے سوالی ہے آیا وہ اس نئی صورتِ حال کے پیش نظر اپنے فکر ونظر کی دنیا کو از سرِنو ترتیب دے، اپنے روایتی طریقۂ کار کا سخت محاسبہ کرے، یا پھر اپنے آپ کو تاریخ کے رحم و کرم پر یونہی چھوڑ دے۔ تاریخ کے آگے خود سپردگی فی نفسہٖ کوئی سوچا سمجھا لائحہ عمل نہیں ہوسکتا۔ رہی یہ بات کہ صورتِ حال کے ازالے کے لیے کیا کیا جائے تو اس بارے میں مسلم ذہنوں میں بالعموم ایک محیط اور پُراسرار سناٹے کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ گویا ہم ایک ایسی وادی میں آ نکلے ہوں جہاں آگے چلنے کی کوئی روایت نہ ہو۔ قدموں کی چاپ سے ہمارے کان نا آشنا ہوں۔

جو لوگ ہماری تاریخ سے واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ پہلا موقع نہیں ہے جب ہمارا ملّی کارواں خطرات کے گرداب میں پھنس گیا ہو، اس سے پہلے بھی کم از کم چار ایسے مواقع آئے ہیں جب من حیث القوم ہمیں اپنی اجتماعی زندگی کا چراغ گل ہوتا ہوا محسوس ہوا ہے۔ خلیفۂ ثالث حضرت عثمانؓ کی شہادت، خلافت عباسی کا زوال، سقوطِ غرناطہ اور انہدامِ خلافتِ عثمانیہ ہماری تاریخ کے وہ بحرانی لمحات ہیں جن سے پہلے بھی ہم نکلنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اپنی تاریخ کے اس پانچویں بحران میں، جس سے آج ہم دوچار ہیں، ہمارے دل و دماغ پر کسی جائے پناہ کے نہ ملنے کا احساس ماضی کے مقابلے میں کہیں گہرا ہے۔ سکڑتی دنیا میں جہاں مواصلاتی سیارچوں کی آنکھیں شب و روز ہمارے تعاقب میں ہیں، جہاں امریکی استعمار نے پوری دنیا میں پھیلے ہوئے مختلف اڈوں کے ذریعے اپنے مخالفین کی ہر آواز کو دبانے کا عزم کر رکھا ہے، کم از کم نفسیاتی طور پر تو یہ احساس عام ہوتا جا رہا ہے کہ صدر بش کے الفاظ میں، ان کے مخالفین کے لیے ''اس سرزمین پر اب کہیں کوئی جائے پناہ باقی نہیں رہ گئی ہے''۔ عراق پر امریکی استعمار کے راست قبضے، افغانستان کا عملی طور پر امریکی نوآبادی میں تبدیل ہو جانا، لیبیا اور ایران کی نیوکلیائی مسئلے پر خود سپردگی، پاکستان اور دوسری مسلم ریاستوں کی شب و روز تذلیل و تضحیک، اس منظرنامے میں ہمارے علما اور دانشوروں کے محض احتجاجی بیانات، مذمت کی قراردادیں یا برسرِ پیکار مسلح نوجوانوں کا ایک ہارتی ہوئی جنگ کو مزید اسی روایتی

انداز سے جاری رکھنا اس بات پر دال ہے کہ ہم بحران کے ان سخت لمحات میں بھی کسی واضح رہنمائی اور سوچے سمجھے منصوبے سے یکسر خالی ہیں۔ مشرق ہو یا مغرب، امن پسند دانشور ہوں یا مسلح جنگجو، قدامت پرست علماء ہوں یا روشن خیال دانشور، واقعہ یہ ہے کہ ہم اس شعور سے خالی ہیں کہ ہمیں جانا کہاں ہے؟

حقیقت گو کہ انتہائی تلخ ہے۔ ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ آج امت مسلمہ اپنے فکری زوال اور عملی انتشار کی وجہ سے خیر امت کے منصبِ جلیل سے معزول ہو چکی ہے۔ آج جو لوگ دنیا کی عملی قیادت کر رہے ہیں یا جو یہاں سیاہ وسفید کے فیصلے کا اختیار رکھتے ہیں بدقسمتی سے وہ ہم نہیں۔ ہماری موجودہ بدحالی اور فکری زوال اپنے پیچھے صدیوں کی تاریخ رکھتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فتنۂ قتل عثمانؓ سے وحی کا جو اجتماعی ماحول متزلزل ہوا اس نے آنے والے دنوں میں ہمارے لیے فکری پراگندگی کا مسلسل مواد مہیا کیا ہے۔ تب سے اب تک ہم مسلمان ماخذِ وحی سے مسلسل دور ہوتے گئے۔ اسلام کا وہ کلمۂ تقلیب انگیز اور ہماری وہ فکرِ بے نیام جو کبھی حریتِ فکر، انسانی آزادی اور مساواتِ آدمیت سے عبارت تھی اور جس سے بجھے دلوں کے چراغ جل اٹھتے تھے اس نے رفتہ رفتہ ایک قومی ایجنڈے کی حیثیت اختیار کر لی۔ پھر ہماری فکر بے نیام میں وہ قوت نہ رہی کہ غیر اقوام کے دلوں کو مسخر کرتی یا انھیں اپنا نجات دہندہ ہونے کا احساس دلاتی۔

تاریخ کے اس نازک لمحے میں جب ہماری فکرِ بے نیام کُند ہو چکی ہے، ہم خود کو اس پوزیشن میں محسوس نہیں کر سکتے کہ اقوامِ عالم کی نجات تو کجا خود اپنی حفاظت کا بھی سامان کر سکیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ صدیوں پر مشتمل ہماری ملّی تاریخ میں ہر دور میں فکر و عمل کی درستگی کے لیے آوازیں اٹھتی رہی ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا دور گزرا ہو جب ہمارے اندر اصلاحِ احوال کے لیے دین کی طرف واپسی کا نعرہ نہ لگایا گیا ہو یا قرآن کے نسخۂ شفا کے استعمال کا مشورہ نہ دیا گیا ہو۔ البتہ عملی طور پر ہوا یہی ہے کہ دین کی طرف ہماری واپسی بڑی حد تک فقہی رسوم کی بازیافت سے عبارت رہی۔ وحیِ ربانی پر انسانی تعبیرات نے التباسات کی جو دبیز دھند طاری کر رکھی تھی اس کے اسرار و عواقب کا صحیح اندازہ لگانے میں ہم سے سخت غلطی ہوتی رہی۔ آخری وحی کے حاملین کی حیثیت سے ہم اس بات کے سزاوار ہیں کہ دنیائے انسانیت کو راہ یاب کرنے کے لیے ہر ممکن قدم اٹھائیں لیکن ایسا تب ہی ممکن ہے جب خود ہمارا فکری اور عملی وجود راست وحیِ ربانی سے غذا حاصل کرتا ہو۔ گویا وحی کی تجلیوں کی از سرِ نو بازیافت کے بغیر ہماری اجتماعی تشکیل جدید ممکن نہیں اور ہماری اس تشکیل جدید کے بغیر اقوام عالم کی موجودہ بے سمتی کا ازالہ بھی ممکن نہیں۔

بیسویں صدی کے نصف آخر اور بالخصوص پندرہویں صدی ہجری کی ابتدا میں مسلم انجمنوں کی چلت پھرت اور علماء و مشائخ کے پرزور خطبوں کے زیر اثر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دنیا پر ایک نئی صبح طلوع ہونے کو ہے۔ ۱۹۷۹ء کا ایرانی انقلاب، افغانستان میں روس کی شکست، روسی استعمار کے بطن سے وسط ایشیا کی مسلم ریاستوں کی غیر متوقع بازیابی، یہ وہ عوامل تھے

جس نے اہل فکر مسلمانوں کو بھی خوش فہمیوں میں مبتلا کر دیا۔ ہم صورتِ حال کا صحیح اندازہ لگانے اور اپنے فکر بے نیام کے کند ہو جانے کے احساس سے غافل رہے۔ ہمارے حوصلہ مند سیاسی قائدین بھی اگر زیادہ سے زیادہ کچھ سوچ سکے تو وہ اسی قدر کہ مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل معاشی، جغرافیائی یا سیاسی بلاک کس طرح تشکیل دیا جائے۔ اپنے تمام تر حسن نیت کے باوجود مسلم معاشرے میں دین کی واپسی کے حوالے سے کرنے والوں نے یہی کیا کہ وہ ایک خاص قسم کے فقہی نظام کو معاشرے پر جبراً نافذ کر دیں۔ نہ تو متحدہ مسلم بلاک کے نظریے میں یہ قوت تھی کہ وہ امت کو بنیان مرصوص میں تبدیل کر سکے اور نہ ہی فقہی یا مسلکی تعبیر ہماری شیرازہ بندی کا کام انجام دے سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی صحوہ اسلامیہ کے فلک شگاف نعروں کی ہوا نکلتی گئی۔ دین کی فقہی تعبیر جو خود اہل ایمان کے دوسرے گروہوں کو ساقط الاعتبار قرار دیتی تھی' بھلا دوسرے ادیان کے لیے نصح خیر خواہی کے جذبے سے سرشار کیوں ہوتی؟ نتیجتاً ہم ایک طرح کے تہذیبی تصادم کی کیفیت سے دوچار ہو گئے۔ نئی دنیا نے مسلمانوں کو مغرب کے اجنبی بلاد و امصار میں قیام کا جو غیر معمولی موقع فراہم کیا تھا، ہم حاملین وحی کی حیثیت سے اس کا خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھا سکے۔ مغرب کے تہذیبی سمندر میں اسلامی مراکز کے نام پر ہم اپنے ثقافتی جزیرے تعمیر کرتے رہے۔ دین کی فقہی تعبیر دیگر تہذیبی حلقوں میں پائی جانے والی سعید روحوں پر بھی اپنے دروازے بند کرتی رہی۔ ﴿یا اهل الکتاب تعالوا الیٰ کلمة سواء﴾ (آل عمران: ٦٤) کی قرآنی پکار اسلامی بیداری کے ہنگاموں میں تحلیل ہو گئی۔ عملاً ہوا یہ کہ احیائے امت کے اس فقہی، مسلکی اور گروہی منہج نے گروہی تصادم کی راہ ہموار کی۔ صحوہ اسلامیہ کی ہماری سر توڑ جدوجہد نے ہمیں ایک ایسی صورتِ حال سے دوچار کر دیا ہے جب ہم من حیث الامت ایک غیر پیغمبرانہ گروہی تصادم کو کفر و اسلام کی جنگ سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ ہم فجر جدید کے بجائے خود کو ایک صبح کاذب کے درمیان پاتے ہیں۔

مشرق اور مغرب کے مابین موجودہ تصادم میں جہاں ایک منتشر اور تباہ حال امت کو' بلکہ صحیح معنوں میں پوری انسانیت کو' امریکی استعمار کے جارح عزائم کا سامنا ہے اور جہاں اسلام کو انارکی اور بے سمت دہشت گردی کا ہم معنی باور کرایا جا رہا ہے، ہمیں من حیث الامت اس خطرناک مہم کے دوررس اسرار و عواقب کا صحیح اندازہ بھی نہیں۔ ہمارے اسلامی ادارے، دینی علوم کی درس گاہیں، غور و فکر کے مؤثر حلقے چوں کہ اسلام کی مخصوص فقہی یا فکری تعبیر کی رہین منت ہیں اس لیے ان کے لیے اپنے فقہی دائرۂ فکر سے باہر آ کر خالص وحی کی روشنی میں موجودہ صورتِ حال کا محاکمہ کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ عالم اسلام کے مختلف خطوں میں مختلف فقہی اندازِ فکر نے جس طرح دینی فکر پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے کی کوشش کی، اس کے نتیجے میں آج خود اہلِ اسلام باہم برسرپیکار نظر آتے ہیں۔ ایسی صورت میں بیرونی خطرات کا مقابلہ کچھ آسان نہیں۔ ماضی میں اگر شیعہ سنی کے باہمی جھگڑے اور حنفی، شافعی کے مابین مسلسل ہونے والے خونی تصادم عباسی بغداد کے سقوط پر منتج ہوئے تھے تو آج بھی بیرونی حملہ آوروں کو ہمارا

اندرونی تضاد اور انتشار مسلسل کمک پہنچا رہا ہے۔ ہمارے فقہا جن کی ذہنی تربیت قرآن مجید کی آفاقیت کے بجائے فقہا کے باہمی مناقشوں کی رہینِ منت ہے، وہ اس بات کا تصور کرنے سے عاجز ہیں کہ مسلکی اور فقہی تعبیر سے پرے خالص وحی کی بنیاد پر مسلم شناخت کی تشکیل ممکن ہے۔ مسلم حنیف کا براہیمی ماڈل عرصہ ہوا ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔

ہمارے زوال کی تلافی صرف ہمارا اندرونی مسئلہ نہیں۔ آخری وحی کے حاملین کی حیثیت سے پوری انسانیت کا مستقبل ہم سے وابستہ ہے، اس لیے امت مسلمہ کے موجودہ انتشار اور اس کے فکری زوال کو نظر انداز کرنا دنیائے انسانیت کے لیے خطرناک مضمرات کا حامل ہوگا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے زوال پر بحث ومباحثہ کا حوصلہ پیدا کریں۔ اپنی طویل تہذیبی تاریخ اور فکری انحرافات کا وحی کی روشنی میں سخت محاسبہ کریں۔ جو امت صدیوں سے فقہی طریقۂ فکر کی عادی ہے اور جس کے دل ودماغ کو علمائے متقدمین کی شخصیت نے مبہوت کر رکھا ہے اس کے لیے یقیناً یہ آسان نہیں کہ وہ صدیوں پر مشتمل اپنے تہذیبی اور علمی سرمایے پر تنقیدی نظر ڈال سکے۔ جہاں قال فلان اور رُوِی فلان پر معاملات فیصل کرنے کا رواج ہو، وہاں ہر مسئلہ پر وحی ربانی کی روشنی میں اپنے دل ودماغ کو متحرک کرنے کی دعوت خواہ کتنی ہی معقول ہو اجنبی ضرور لگے گی۔ ہوسکتا ہے بعض لوگوں کو اس پر تجدد پسندی کا گمان ہو، لیکن جو لوگ قرآن مجید میں رسول اللہؐ کے مقصد بعثت سے متعلق اس ارشاد سے واقف ہیں ﴿ویضع عنهم اصرهم والأغلال التی كانت علیهم﴾ (الأعراف:۱۵۷) ان کے لیے اس نکتے کا ادراک مشکل نہیں کہ جس طرح قرآن مجید، خدا اور بندے کے مابین کسی ربائیت یا پاپائیت کو قابل استرداد سمجھتا ہے، اسی طرح وہ مولویت کے ادارے کا بھی انکاری ہے۔ نہ تو تشریح وتعبیر پر کسی کی اجارہ داری ہے اور نہ ہی کسی کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ کسی کی صحیح العقیدگی پر شبہ وارد کرے۔ اہلِ ایمان کو تو چھوڑیئے، اللہ تعالیٰ نے تو حلقۂ اسلام سے باہر افراد کا فیصلہ بھی اپنے ہاتھوں میں محفوظ رکھا ہے: ﴿ان اللہ یفصل بینهم یوم القیامة﴾۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا، دائرۂ وحی سے ہمارے باہر آجانے کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ ہم خیر امت کے منصب جلیل سے معزول ہوگئے، بلکہ پوری انسانی تاریخ جس کی آخری لمحے تک ہمیں قیادت کرنی تھی، سخت بحران سے دوچار ہوگئی۔ تاریخ کے اس سب سے بڑے انحراف کی درستگی کے لیے لازم ہے کہ ہم ان اسباب پر ایمان دارانہ غور وفکر کریں، جس نے ہمیں انسانیت کی قیادت سے ہٹا کر تاریخ کے dustbin میں ڈال دیا ہے۔

یاد رکھیے! جو لوگ خود کو آخری وحی کا حامل سمجھتے ہوں اور جو جذباتی طور پر اس احساس سے سرشار ہوں کہ انھیں تاریخ کے آخری لمحے تک اقوامِ عالم کی قیادت پر مامور کیا گیا ہے، وہ اگر رضا کارانہ طور پر اسی طرح تاریخ کے dustbin میں مزید پڑے رہے تو دنیا فتنہ وفساد سے بھر جائے گی۔ انسانی آزادی کا جو بگل مختلف انبیاء نے اپنے اپنے زمانے میں بجایا تھا اور جس کی بدولت

آج ہمیں دنیا کے مختلف گوشوں میں انسانی آزادی اور اکرامِ آدمیت کی باتیں سننے کو ملتی ہیں، یہ تحریک رفتہ رفتہ دم توڑ دے گی۔ انسانی گردنوں کو اصر واغلال سے نجات دلانے کے لیے محمدؐ رسول اللہ کی سعی بلیغ پر ربائیت، پاپائیت اور مولویت پھر سے اپنی کمندیں ڈال دے گی۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم موجودہ War on Terror کے اسرار وعواقب کا مقابلہ کرنے کے لیے، جہاں ایک بار پھر انسانی آزادی سخت خطرے میں گھر گئی ہے، فی الفور اپنے دل ودماغ کو حرکت دیں۔تاریخ کے انحراف کو درست کیے بغیر اور امت مسلمہ کی دوبارہ تنصیب امامت کے بغیر یہ ممکن نہیں کہ ہم پر وہ خواب آسا دنیا طلوع ہو، جہاں انسانوں کی گردنیں انسانوں کی دست درازی سے یکسر محفوظ ہوں۔موجودہ شہری تہذیب میں جہاں فرد آزادرہ کر بھی نظام کے ہاتھوں بندھوا مزدور بن گیا ہے، جہاں اس کے خون کا قطرہ قطرہ ٹیکس کی جبری مشین کو متحرک رکھنے میں صرف ہورہا ہے، اس نامحسوس غلامی سے نجات کا کام بھی آخری وحی کے حاملین کو انجام دینا ہے۔

ہمیں نہیں معلوم کہ حاملِ قرآن ہونے کے واقعی مطالبات کیا ہیں۔ ہم قرآن مجید کی آفاقی دعوت کو فقہاء کی انسانی تعبیرات کا مماثل یا اس کا متبادل سمجھنے کی غلطی میں مبتلا ہیں لہذا دینی معاشرہ کے نام پر فی الفور ہمارے ذہنوں میں ایک ایسے معاشرے کا تصورا بھرتا ہے جہاں قدیم فقہاء کے دواوین اچانک قانون بن گئے ہوں۔ ہم جب تک انسانی تعبیرات کو وحی کا ہم پلہ سمجھتے رہیں گے اور جب تک راست وحی کے بجائے تعبیرات انسانی پر ہمارا انحصار باقی رہے گا دنیا کی کوئی قوت ہمارے جاری زوال پر روک نہیں لگا سکے گی۔

سلسلۂ غور وفکر کی موت

دنیا پر امریکی استبدادی نظام کے استحکام کے ساتھ ہی ایک نئے امریکی اسلام کی آواز بھی سنائی دینے لگی ہے۔ بقول آیت اللہ خامنئی یہ ایک ایسے کمزور اور پسماندہ اسلام کی طرف دعوت ہے جو امریکی اصولوں کے ساتھ چلتا اور مغربی تصورات سے غذا حاصل کرتا ہے۔ خامنئی اور عالم اسلام کے دوسرے رہنماؤں کی تشویش یقیناً بجا ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں ایسے خود ساختہ مسلم مسیحاؤں اور رہنماؤں کی گویا باڑھ سی آ گئی ہے جو اسلام کو امریکی خارجہ پالیسی کی عینک سے دیکھنا پسند کرتے ہیں اور جو بڑی بے شرمی سے صدر بش کو مسلم دنیا کا مسیحا قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک، بلکہ کہنا چاہئے، ان کے لئے صدر بش حریت کے علمبردار ہیں جنگ کے نہیں۔ فی زمانہ امریکہ میں ایسے مسلمان بھی موجود ہیں جو خود کو اہل فکر سمجھتے ہیں اور ساری دنیا کو یہ باور کرانے پر تلے بیٹھے ہیں کہ عراق پر امریکی تسلط کے ذریعہ دراصل عرب دنیا میں تحریک اصلاح کے لئے راہ ہموار ہوگی۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر بعض نام نہاد مسلم دانشور امریکہ کے ساتھ امریکہ کے لئے جنگ میں شامل ہونے کو دینی فریضہ گردانتے ہیں اور برملا اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ امریکی شہری کی حیثیت سے ان پر یہی کچھ فریضہ عائد ہوتا ہے۔ یہ تو رہی اسلام کے ایک ایسے نامانوس قالب کی بات جسے ہم امریکی اسلام سے تعبیر کرتے ہیں۔

البتہ عالم اسلام کے بڑے شہروں، مسلم ممالک کے دارالحکومتوں مثلاً ریاض، قاہرہ اور اسلام آباد میں امریکہ کے سلسلے میں جو جذبات پائے جاتے ہیں وہ بالکل ہی ایک دوسری کہانی سناتے ہیں۔ عالم اسلام میں امریکہ کو ایک بیرونی استبداد کے طور پر دیکھا جاتا ہے اور عام خیال یہ ہے کہ عراق میں لڑی جا رہی جنگ ظالم اور مظلوم کی جنگ ہے۔ بلکہ بعض تو اسے اسلام اور کفر کے درمیان معرکہ آرائی بتاتے ہیں۔

عناصر صرف ۱

اسلام نے اس

نمازیں

مسلمانوں کا قومی اسلام، صدیوں اسلام کی آفاقیت سے مزاحم ہوتا رہا ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو شاید خلافِ واقعہ نہ ہو کہ دین کی اس خالص تہذیبی تعبیر نے صدیوں سے اسلام کی آفاقیت کو شکست دے رکھا ہے۔ فی زمانہ ان فتووں پر کسے اب یقین آئے گا کہ غیر عربی طرز کے لباس پہننا یا غیر عربی انداز سے بالوں کا تراشوانا حرام ہے یا یہ کہ فارسی زبان کا سیکھنا (جس میں اب انگریزی، فرنچ، جرمن اور دوسری غیر عرب زبانوں کو بھی شامل کیا جانا چاہیے) من تشبہ کی رو سے حرام ہے۔ اب کون اس بات پر یقین کرے گا کہ انگریزی زبان منافق بناتی ہے؟ اور کون اس فتوے کو معتبر سمجھے گا کہ غیر مسلم ملکوں میں رہائش اختیار کرنے والا شخص بروز حشر مشرکوں میں اٹھایا جائے گا؟ کیا اہل سنت والجماعت کا کوئی شخص آج بھی ابن تیمیہ کی طرح اس عقیدے کا متحمل ہو سکتا ہے کہ جنس عرب جنس عجم سے افضل ہے؟

مستقبل اسلامی کی تلاش

جب لوگ باہم ملا دیئے جائیں گے
جب نوزائیدہ زندہ درگور بچی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس جرم کی پاداش میں قتل کی گئی
جب صحیفوں کی نشرو اشاعت کی کثرت ہوگی
جب جنت قریب لے آئی جائے گی
تب ہر شخص کو پتہ چل جائے گا کہ وہ اپنے لئے کیا لایا ہے۔
(تکویر:۱۴-۷)

سورۃ تکویر کی ان آیات کا مطالعہ کرتے ہوئے ذہن برملا سائبر اسپیس کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو قرآن مجید جس ذات باری کا کلام ہے وہ زمان ومکان کے فرق سے ماوراء چیزوں کو اس کی اصل ماہیت کے ساتھ اس طرح دکھاتا ہے گویا ازل تا ابد بجلی کی ایک چمک اور بصیرت کی ایک رعد کے ساتھ سب کچھ اچانک ایک لمحے کے لئے منور ہو گیا ہو۔

عام انسانی دنیا سے ماوراء ایک ایسے virtual world کا وجود میں آجانا جہاں کروڑ ہا کروڑ نفوس ایک دوسرے سے بحث ومباحثہ اور باہمی استفادے میں مشغول ہوں، ایک حیرت ناک وقوعے سے کم نہیں۔ عالمِ محسوسات سے پرے ایک ایسی اضافی دنیا کا وجود جو مسلسل ہماری زمینی زندگی کو متاثر کر رہی ہو، اب ایک ایسی حقیقت ہے جسے مزید نظر انداز کرنا اب ماضی پرست قوموں کے لئے بھی ممکن نہیں رہا۔ صحیفوں کی نشرو اشاعت کا یہ عالم ہے کہ جس موضوع پر بھی بٹن دبایئے معلومات کا ایک لامتناہی سمندر موجود ہے۔ ہر قسم کے افکار وخیالات اپنی تمام تر خباثتوں اور سعادتوں کے ساتھ قاری کے منتظر ہیں۔ انٹرنیٹ کی اس virtual دنیا میں نہ کوئی محتسب مؤثر رہ گیا ہے اور نہ ہی کسی خیال کو محض قوت کی بنیاد پر دبا ڈالنا ممکن ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس سائبر دنیا کا نہ کوئی مرکز ہے اور نہ ہی کسی خاص تہذیب یا عسکری قوت کی اس دنیا پر اجارہ داری ممکن رہ گئی ہے۔ گویا Cyber Space ایک ایسی پوسٹ ماڈرن دنیا کی ایک جھلک ہے جہاں خیالات کو محض اس کی حقیقی قدر و قیمت کی بنیاد پر قبول یا

رد کیا جانا ممکن ہو سکے گا۔ اب انسانی دل و دماغ کیلئے یہ ممکن ہے کہ وہ مولوی یا محتسب کی چیرہ دستیوں سے یکسر آزاد ہو کر تہذیبی اور قومی سطح سے اوپر اٹھ کر اللہ کے عطا کردہ قلبِ سلیم کو حتی المقدور استعمال میں لائے اور پھر اپنی صوابدید پر، عقل و نظر کی روشنی میں اپنے لئے ایک بہتر راستے کا انتخاب کر سکے۔ انٹرنیٹ کی دنیا میں شیطان کے وساوس بھی ہیں اور خدا ترسوں کی دردمند رہنمائی بھی۔ فقہاء و مشائخ کے طئے کردہ حتمی جواب بھی ہیں اور وحی ربانی کو سمجھنے کیلئے خود اپنے دل و دماغ کو متحرک کرنے کی دعوت بھی ۔ اگر ایک طرف مختلف نظریات کا اپنا اپنا مسحور کن پروپیگنڈہ ہے تو دوسری طرف اس کے رد میں بھی کم مضبوط دلائل نہیں ۔ گویا ﴿اذا الصحف نشرت﴾ کا غلغلہ ہر طرف بلند ہے۔ واشنگٹن کے پرآسائش سوٹ میں بیٹھنے والا انسان ہو یا افغانستان کے نامعلوم پہاڑی سلسلوں میں بسنے والا شخص، انٹرنیٹ کی دنیا میں دونوں برابر کا شریک ہے۔

دیکھا جائے تو انسانی تاریخ میں فکر و نظر کی آزادی کا اتنا وافر امکان پہلے کبھی نہ تھا۔ قلب و نظر کو جلا بخشنے کیلئے جس ذہنی افق اور بین الاقوامی مباحثے کی ضرورت تھی، اس کا ماحول تیار ہو چکا ہے۔ اس نئی صورتحال نے روایتی علماء کے قیل وقال سے پَرے ،فرقہ وارانہ تعبیر اور مسلکی تشریحات سے ماوراء، ایک ایسے ہمہ گیر مباحثے کی بناء ڈال دی ہے جس کے بطن سے فی زمانہ دینِ خالص کے طلوع ہونے کے امکانات وا ہو گئے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ انٹرنیٹ کی دنیا میں فکر و نظر کی بے مہار آزادی ہمیں ایسے سطحی اور junk مباحثے میں بھی الجھا سکتی ہے جس سے ہماری موجودہ پریشاں خیالی میں مزید اضافہ ہو جائے۔ Information کے اس سیلاب میں disinformation کے ریلے بھی بہہ رہے ہیں۔ ان خطرات کا مقابلہ تو بہر حال کرنا ہوگا۔ دودھ کو پانی سے اور حق کو باطل سے ممیّز کئے بغیر ہماری منزل بامراد نہ ہوگی۔ البتہ جو لوگ وحی کی روشنی کو اپنی مشعلِ راہ بنانے کا عزم رکھتے ہوں ان کے لئے عمومی کنفیوژن کی اس فضا میں راستہ بنانا کچھ مشکل نہ ہوگا۔

کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہم سائبر ورلڈ میں کسی نئے اسلام کے ظہور کے منتظر یا اس کے لئے کوشاں ہیں۔ دین خالص وحی ربانی کو ایک ایسی صورت حال میں پیش کرنے سے عبارت ہے جب زمان و مکان یا تہذیبی مظاہر کا پرتو وحی ربانی پر تقریباً معدوم ہو گیا ہو۔ خدا کا دین بندوں کی اس سائبر دنیا میں کچھ اس طرح جلوہ فگن ہو گویا وہ تمام انسانوں کو شمولیت کی یکساں دعوت دے رہا ہو۔ نہ وہ مشرق کا پرستار ہو نہ مغرب کا مخالف، نہ اسے عربوں سے کوئی خاص انسیت ہو نہ عجمیوں سے کسی درجے کی مخاصمت، نہ وہ ایشیاء والوں کا دین سمجھا جاتا ہو اور نہ کسی ایسے خاص تہذیبی قالب کا حامل کہ اہل مغرب اسے Middle-Eastern Religion قرار دیتے ہوں، گویا ایک ایسا اسلام جس کی مکمل تصویر قرآن مجید کے دفتین میں پائی جاتی ہو اور جسے سمجھنے کیلئے مسلمانوں کی تہذیبی تاریخ یا اموی، عباسی جاہ و حشم کے بیان کی چنداں ضرورت نہ ہو اور نہ ہی مسلم اسپین، مغل دہلی اور عثمانی ترکوں کی تہذیبی تاریخ کا اس پر پرتو پایا جاتا ہو۔ ایک ایسا اسلام جو تمام انسانیت کا نجات دہندہ ہو اور جس کے غلبے کی دعوت کسی خاص

قوم کے تہذیبی غلبہ کی نفی سے عبارت ہو۔ محمد رسول اللہ جو کہ کافۃ للناس بشیرا ونذیرا ہیں اور جن کی رحمۃ للعالمینی پر قرآن کے صفحات گواہ ہیں، ان کی دعوتِ لا الہ کی منطقی انتہا ایک ایسے ہی منظرنامے کی طالب ہے جب تمام مسلکی مظاہر سے اوپر اٹھ کر عالمی سطح پر انسانوں کو خدائے واحد کی بندگی میں مربوط کر دیا جائے۔ ایک ایسے غیر تہذیبی اسلام کے ظہور کیلئے سائبر دنیا سے بہتر اور کون سی جگہ ہوسکتی ہے؟

روایتی مسلم ذہن کیلئے سائبر ورلڈ نئے چیلنجز کی آماجگاہ ہے۔ قدیم فقہی اصطلاحوں کا یہاں سرے سے اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ سائبر ورلڈ میں دارالاسلام او ردارالکفر کی اصطلاحیں بے معنی ہو کر رہ گئی ہیں، یہاں نہ کوئی centre ہے اور نہ periphery۔ بیک نظر مجموعی طور پر اس دنیا میں خیر بھی ہے اور شر بھی۔ امکانات کے اس سمندر سے فرد پر منحصر ہے کہ وہ اپنے کوزے میں کیا کچھ توشہ جمع کرتا ہے۔ کل تک جو لوگ دنیا کو تہذیبی اکائیوں میں منقسم دیکھنے کے عادی تھے، یا جو محمد رسول اللہ کے آفاقی پیغام کو عرب تہذیب میں محدود کئے دینے کے قائل تھے، یا جو یہ سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ عرب تہذیبی مظاہر ہی دینِ اسلام کی واحد مستند شکل ہیں، ان کے لئے یقیناً اس نئی صورتحال کو سمجھنا مشکل ہوگا کہ کس طرح سائبر ورلڈ میں اسلام کا آفاقی پیغام، اپنے قدیم عربی قالب سے ماوراء، تمام انسانوں کیلئے یکساں توجہ اور کشش کا باعث بن رہا ہے۔ ہمارے زوال کے عہد میں تحفظِ اسلامی کی خاطر عرب تہذیبی مظاہر پر غیر ضروری اصرار کی جو لئے اپنے اپنے زمانے میں ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ کے یہاں غیر معمولی طور پر بلند ہوتی گئی تھی اور جس کے نتیجے میں اسلام کو عرب مشرقی ورثے کے طور پر دیکھنے کا رواج عام ہوا، التباسات کی یہ دھند بھی اب چھٹنے کو ہے۔ ﴿اذ النفوس زوجت﴾ کی عموعی فضا میں اب ہمارے لئے یہ سمجھنا آسان ہے کہ آفاقی نبی کی امت کسی ایک تہذیبی مظاہر، جغرافیائی ماحول اور اس سے متاثر لباس کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اب بھی اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ کسی خاص زبان سے اسلام کو نفرت ہے یا کوئی خاص لباس غیر قوموں کا لباس ہے جس کے پہننے سے اسلام رخصت ہو جاتا ہے تو اس کا یہ سمجھنا ایک بین الاقوامی پیغمبر کی آفاقیت کو مشتبہ کر دیتا ہے۔ من تشبہ بقوم فھو منھم کی فرضی حدیث اور اس کی خیالی تعبیرات نے صدیوں سے اسلام کو ایک عرب تہذیبی اکائی کے طور پر متعارف کرا رکھا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مکانی فاصلوں کے سکڑنے کی وجہ سے اب یہ مفروضات خود بخود ختم ہو رہے ہیں۔ کل تک جو بات فقہائے حنابلہ، فقہائے احناف کیلئے سمجھنا مشکل تھی اور جس کی وجہ سے تہذیبی مظاہر کی بنیاد پر کفر و اسلام کے فتوے صادر کرنے کا رواج عام تھا آج وہی بات نئی سکڑتی دنیا میں قرآن کے معمولی طالب علم کے لئے بھی سمجھنا آسان ہوگئی ہے کہ تہذیبی مظاہر یا لباس کی بنیاد پر کفر و اسلام کا فیصلہ نہیں ہوسکتا۔ ابن تیمیہ کا یہ فہم جس کا شدید اظہار انہوں نے اقتضاء صراط المستقیم فی مخالفہ اصحاب الجحیم میں کیا ہے اور اس قبیل کے دیگر علماء کا قومی اسلام، صدیوں اسلام کی آفاقیت سے مزاحم ہوتا رہا ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو کچھ خلافِ واقعہ نہ ہوگا کہ دین کی اس

خالص تہذیبی تعبیر نے صدیوں سے اسلام کی آفاقیت کو شکست دے رکھا ہے۔﴿اذا النفوس زوجت﴾ کے موجودہ ماحول میں اب ان فتووں پر کسے یقین آئے گا کہ غیر عربی طرز کے لباس پہننا یا غیر عربی انداز سے بالوں کا تراشوانا حرام ہے یا یہ کہ فارسی زبان کا سیکھنا (جس میں اب انگریزی، فرنچ، جرمن اور دوسری غیر عرب زبانوں کو بھی شامل کیا جانا چاہیے) من تشبہ کی رو سے حرام ہے۔ اب کون اس بات پر یقین کرے گا کہ انگریزی زبان منافق بناتی ہے؟ اور کون اس فتوے کو معتبر سمجھے گا کہ غیر مسلم ملکوں میں رہائش اختیار کرنے والا شخص بروز حشر مشرکوں میں اٹھایا جائے گا؟ کیا اہل سنت والجماعت کا کوئی شخص آج بھی ابن تیمیہ کی طرح اس عقیدے کا متحمل ہوسکتا ہے کہ جنس عرب جنس عجم سے افضل ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی خالص قومی اور تہذیبی تعبیر نے ایک آفاقی دین کو نہ صرف یہ کہ ایک عرب مشرقی ورثے کی حیثیت دے دی بلکہ آنے والے دنوں میں حاملین قرآن کیلئے خالص قومی بنیادوں پر مسابقت کی طرح بھی ڈال دی۔ دوسری قوموں کی طرح مسلمان بھی عالمی غلبہ کا خواب دیکھنے لگے۔ پندرہویں صدی ہجری کی ابتداء میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کے حوالے سے غلبۂ اسلام کی جو امید بندھی تھی اس سے غیر تو یہ سمجھتے ہی تھے کہ مسلم قوم ایک بار پھر دنیا پر اپنے سیاسی غلبہ کا خواب دیکھ رہی ہے، خود مسلم ذہنوں میں بھی اسلامی صدی کا مفہوم اس سے کچھ مختلف نہ تھا کہ صدیوں سے جو قوم مسلسل پسپائی اختیار کرتے ہوئے تاریخ کے حاشیے پر چلی گئی ہے وہ ایک بار پھر دنیا پر غالب ہونے کو ہے۔ قومی اسلام کے اس تصور نے دوسری قوموں کی طرح اہل اسلام کو بھی مسابقت کی اس دوڑ میں مبتلا کر دیا۔ اہل یہود جن کا دعویٰ ہے کہ بیسویں صدی میں وہ اپنی موثر ترین سرگرمیوں کی وجہ سے اکیسویں صدی کی قیادت کے سب سے زیادہ سزاوار ہیں یا مغرب کی بعض اقوام خصوصاً امریکہ جو اکیسویں صدی پر مکمل غلبہ کو اپنا حق سمجھتا ہے، اسی طرح مسلم ذہنوں میں بھی قومی اسلام کے زیر اثر یہ خیال پرورش پاتا رہا ہے کہ پندرہویں صدی ہجری یا اکیسویں صدی عیسوی آخر مسلمانوں کے غلبہ واستیلاء کی صدی کیوں نہ ہو؟۔ افغانستان میں سوویت یونین کی شکست کے بعد مجاہدین کی جواں سال قیادت کے ذہنوں میں فطری طور پر اس خیال نے انگڑائی لی کہ سوویت یونین کے زوال کے بعد اب ان کا منطقی وظیفہ یہ رہ گیا ہے کہ وہ امریکہ کے خلاف اپنی تمام تر توجہ مرکوز کر دیں۔ ان کے نزدیک مغرب پر مشرق کی فتح کا یہی ایک واضح اور آسان راستہ تھا۔ اس میں شبہ نہیں بن لادن اور دوسرے عرب مجاہدین کو اس تہذیبی ٹکراؤ کی راہ پر ڈالنے والے دوسرے عناصر بھی تھے البتہ مغرب کے مقابلے میں ایک مشرقی اور قومی اسلام کی فتح کا داعیہ ان کے دل ودماغ کو مسلسل مہمیز کرتا رہا ہے۔ تہذیبی اسلام کا یہ مروجہ قالب جو عرب مشرقی ثقافت کو اسلام کا لازمی جز قرار دیئے بیٹھا ہے، نفسیاتی طور پر اس بات کا متحمل نہیں ہوسکتا کہ وہ دوسری تہذیب کی سعید اور صالح روحوں کو بھی غلبۂ اسلام کے منصوبے میں شامل کر سکے یا یہ کہ اسلام کو ایک ایسے ہمہ گیر بین الاقوامی قالب میں متحضر دیکھے جہاں تہذیبوں کے بجائے صرف وحی ربّانی کی بنیاد پر ایک نئی دنیا کی تعمیر کا منصوبہ پایا جاتا

ہو۔واقعہ یہ ہے کہ اس مروجہ تہذیبی اسلام نے مسلم نوجوانوں کے ذہنوں سے اسلام کی آفاقیت اور تمام ہی اقوام وملل کیلئے نصح و خیر خواہی، ہمدردی وغم گساری جیسے جذبات کو دور کر رکھا ہے جو داعی کا بنیادی وصف ہے۔اسلام کو اس محدود تہذیبی خول سے نجات دلانے اور اسے پیغمبرانہ آفاقی پیغام کی حیثیت سے پیش کرنے کیلئے ہمیں اپنے تہذیبی اور علمی ورثے کے سخت احتساب کی ضرورت ہوگی۔اندیشہ ہے کہ اس عمل میں بڑے بڑے شارحین اور علمائے عظام کا اعتبار ساقط ہو جائے۔جو لوگ بعض اصحاب سلف کو یا اپنی پسند کے ائمہ وفقہاء کو قرآن مجید کی شاہِ کلید قرار دیتے آئے ہیں اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان حضرات کے بغیر فہم قرآن کا قفل نہیں کھل سکتا، ان کے لئے اس صورتِ حال کا ادراک یقیناً مشکل ہوگا۔صدیوں سے جو لوگ اسلامی فلسفہ، اسلامی آرٹ، اسلامی فنونِ لطیفہ اور اسلامی طرزِ تعمیر جیسی اصطلاحوں میں کلام کرتے رہے ہیں، ان کو یہ باور کرانا کچھ آسان نہ ہوگا کہ عباسی بغداد کا فنونِ لطیفہ، مسلم اسپین کا سائنسی عروج، اور مغل سلطنت کے تاج محل یا لال قلعہ کے لافانی نقوش، جن کو مسلمان اپنی تہذیبی تاریخ کے سنگ میل کے طور پر پیش کرتے ہیں دراصل ہم ان تمام کاموں کیلئے مامور ہی نہیں کئے گئے تھے۔قومی افتخار کی ان تمام علامتوں کا کارِ نبوت سے کچھ بھی علاقہ نہیں۔رہا علم وحکمت اور علوم وفنون کی ترقی تو یہ کسی قوم کی میراث کبھی نہیں سمجھے گئے۔یہ نوع انسانی کا مشترکہ ورثہ ہیں اور انہیں اسی حیثیت سے دیکھا جانا چاہیے۔

قومی اسلام کا یہ تصور جس کی جڑیں ہمارے متقدمین کی فہم وبصیرت میں ہیں، خالص اسلام کی طرف ہماری مراجعت میں مسلسل مزاحم ہوتی رہی ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہو کہ اسلام کے اس قومی تصور نے فی زمانہ پوری دنیا میں مسلم نوجوانوں اور ان کی احیائی تحریکوں کو ایک غولِ بیابانی میں تبدیل کر رکھا ہے۔قدیم مشرقی ثقافتی علامتوں کو وہ اسلام سمجھ بیٹھے ہیں، جس سے ذرہ برابر بھی انحراف کفر واسلام کی جنگ بن جاتی ہے۔مسلمانوں کے جغرافیائی تنازعے اور وطنی آزادی کی تحریکیں جہادِ فی سبیل اللہ قرار پاتی ہیں۔ثقافت اور اسلام کے اس مسلسل دھوپ چھاؤں کے کھیل نے خود مسلم ذہنوں پر اسلام کی ماہیت اور اس کے مستقبل کے سلسلے میں سخت ابہام اور مغالطوں کو جنم دیا ہے۔اس میں شبہ نہیں کہ مسلمان گذشتہ چند صدیوں سے من حیث القوم مسلسل پسپائی کے شکار ہیں اور گذشتہ چند برسوں سے پسپائی کا یہ عذاب اپنی انتہاء پر ہے۔افغانستان، عراق، فلسطین، بوسینا، کشمیر ، گجرات، فلپین اور چیچینا جہاں بھی خون بہہ رہا ہے وہ ان ہی قومی مسلمانوں کا خون ہے۔امریکہ، برطانیہ اور مغرب کے دوسرے شہروں میں دہشت گردی کے نام پر مسلم نوجوان ہی نشانے پر ہیں۔گوانٹناموبے کی عقوبت گاہ یا ابوغریب کی جیل میں جو کچھ ہوا اسکا شکار بھی مسلم قوم ہی بنی۔لیکن ان سب کے باوجود اگر مسلمان بھی مدافعت کی جنگ میں ان اعلیٰ انسانی اقدار کو نظر انداز کر گئے تو پھر دوسری قوموں پر ان کا وجہِ امتیاز کیا رہ جائے گا؟ گجرات میں ہم جلائے گئے، بوسنیا میں ہماری عزتیں تاراج ہوئیں۔فلسطین میں ہم ایک منظّم ریاستی دہشت گردی کا شکار ہیں لیکن اس کے جواب میں ہم اپنے دشمنوں کے ساتھ عین یہی سب کچھ نہیں

کر سکتے۔قومی مسلمانوں کیلئے تو یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی قوم کے مقابلے میں دشمن قوم کو زک پہنچانے کیلئے کوئی بھی اقدام کر ڈالیں۔ البتہ وحی کا آفاقی نقطۂ نظر ہمیں مسلسل اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ ہم بعض شیطان صفتوں کی وجہ سے اس پوری قوم کو من حیث القوم قابلِ گردن زدنی قرار نہیں دے سکتے۔ہم جو انسانوں کی نصح و خیر خواہی اور ان کی فلاح و نجات کے لئے پیدا کئے گئے ہیں ہم انھیں اس طرح دیکھتے ہیں جیسا کہ وہ ہیں نہ یہ کہ ان کا تعلق کس قوم سے ہے۔ بڑے بڑوں کے دل و دماغ پر مسلم قومی افتخار اور مسلم قومی مفاد کے جذبات اتنے شدید ہیں کہ وہ کسی بھی مسئلہ پر خالص حاملِ قرآن کی حیثیت سے سوچنے کا یارا نہیں رکھتے۔ مسئلہ فلسطین کا لاینحل ہونا خدائے واحد کی علمبردار دو قوموں کا اتنے طویل عرصے تک آپس میں اس طرح گتھم گتھا ہونا اور پھر اس صورتِ حال پر مسلمانوں اور اہل یہود کے علماء و متقین کا مسلسل خاموش رہنا اسی بات کا تو ثبوت ہے کہ اہل یہود کے علماء کی طرح مسلم اہل فکر بھی قومی افتخار کے اس حد تک اسیر ہو گئے ہیں کہ وہ کوئی غیر روایتی حل پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔دنیا فساد سے بھرتی جارہی ہے۔قوموں کے تصادم کے اس ماحول میں جہاں خود حاملین قرآن بھی بدقسمتی سے اس قومی تصادم میں فریق بن گئے ہیں،ضرورت اس بات کی ہے کہ اس آفاقی اسلام کو وحی کے دفتین سے از سرِ نو برآمد کیا جائے جس کے پسِ پشت چلے جانے کی وجہ سے ہم تاریخ کے انحراف میں جینے پر مجبور ہیں۔

دینی تحریکیں ابھی تک عہد عباسی کے فقہی تصورات کو ہی دین کا ماحصل سمجھتی ہیں، وہ اس دانشورانہ چیلنج کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں کہ قرآنی نظامِ رحمت کی تعبیر مزاحمت اور مدافعت کی زبان سے پرے بھی ہوسکتی ہے۔قرآن جہاں وسعت قلب ونظر کا داعی ہے وہیں فقہی اور مسلکی طرزِفکر خود مسلم معاشرے کو ایک خانہ جنگی میں مبتلا کر دیتی ہے۔خود کو مستند مسلمان بتانے اور دوسروں کو دائرہ اسلام کی سرحد پر بھی جگہ نہ دینے کے رویے نے مختلف مسلم معاشرے کو ایک طرح کی خانہ جنگی میں مبتلا کر رکھا ہے۔

کیا ایک نئی پیمبرانہ بصیرت ممکن ہے؟

کہ نابینا اور چشم بینا رکھنے والا برابر نہیں

اور نہ ہی تاریکی اور روشنی

اور نہ ہی سایہ اور دھوپ

(فاطر: ۱۹ تا ۲۱)

عہد جدید کے عذابوں میں ایک بڑا عذاب نظر کے فریب کا ہے، میڈیا کی پیدا کردہ اس دنیا میں ہم ایک سرابِ مسلسل سے دوچار ہیں، منظر نامہ اتنا کریہہ ہے کہ اگر وہ اپنی اصل صورت میں نظر آ جائے تو ہم میں سے بہتوں کے ہوش وحواس خبط ہو جائیں، انسان جینے کا حوصلہ کھو دے، دل و دماغ مفلوج ہو جائے لیکن مصیبت یہ ہے کہ نگاہوں کے سحر اور بصیرت کے فقدان نے ہمیں صورت حال کی سنگینی کے ادراک سے روکے رکھا ہے، یہ کچھ وہی صورت حال ہے جب اہل زمین کی ہدایت کے لئے خدا اپنے پیغمبروں کو بھیجتا ہے، اللّٰھم أرني الأشياء كما ھي۔

انبیاء کا بنیادی کام قلب ونظر کی تبدیلی ہوتا ہے، ان کی دعوت الی اللہ ایک نیا world view وجود میں لاتی ہے۔ قرآن کی زبان میں ظلمات سے نور کا یہ سفر اندھوں کو چشم بینا عطا کرتا ہے، اشیاء اپنی اصل ماہیئت میں نظر آنے لگتی ہیں، توہمات کے پردے چاک ہو جاتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے گویا مردہ اور بے جان میں از سر نو زندگی کی روح پھونک دی گئی ہو، حضرت مسیحؑ کے حوالے سے قرآن مجید میں زندگی کا نیا صور پھونکنے اور شفاءِ قلبی عطا کئے جانے کا واقعہ گو کہ خصوصیت سے بیان کیا گیا ہے البتہ ﴿شفاء لما في الصدور﴾ (یونس: ۵۷) کا یہ آسمانی نسخہ آج بھی قرآن مجید کی شکل میں اس سرزمین پر موجود ہے۔ محمد رسول اللہ نے کوئی پندرہ صدیوں پہلے جب خوابیدہ انسانیت کو ایک فکری، عقلی، اور روحانی دھماکے سے آشنا کیا اس وقت ایسا محسوس ہوتا تھا کہ انسانی دل و دماغ میں تمام پوشیدہ صلاحیتیں اپنی انتہائی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے لگی ہیں۔ قلب ونظر کی دنیا میں اس زبردست ربانی دھماکے کی گونج مدتوں سنی جاتی رہی، حتی کہ آج بھی جب اس واقعہ پر پوری پندرہ صدیاں بیت چکی ہیں ارتعاش کی

ان لہروں کا سلسلہ تھمانہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اب گونا گوں لہروں میں اس کا وہ تفوق باقی نہیں رہا۔صورت حال یہاں تک آ پہنچی کہ دنیا کی دوسری قوموں کی طرح مسلمانوں کی ایک قابل ذکر آبادی بھی آج اس خیال کو دل سے لگائے بیٹھی ہے کہ کوئی مہدی منتظر یا مسیح موعود اسے موجودہ صورت حال سے نجات دلانے کے لئے گویا بس اب آنے ہی کو ہے، بالفاظ دیگر دوسری اقوام کی طرح مسلمان بھی ایک نئے ذیلی نبی کے منتظر ہیں یا کم ازکم ان کی نگاہیں ایک ایسی روشنی کے نزول کے لئے آسمان تک اٹھ رہی ہیں جو فی زمانہ غیاب محمدی کی کفایت کر سکے۔

مسلمانوں کی مسلسل ہزیمت کے پیش نظر کسی ایسے داعیہ کی نفسیاتی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے کہ Crusoe-like-approach کا قبولیت اختیار کر لینا ہزیمت خوردہ قوموں کا خاصہ ہوا کرتا ہے۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ نئے مسیحا کے انتظار میں دوسری اقوام بھی پیچھے نہیں۔عیسائیت گو کہ آج بھی غالب اقوام کا دین ہے لیکن خود عیسائیت کے اپنے گڑھ میں صدیوں سے اسے مسلسل جس فکری اور نظری پسپائی کا سامنا ہے اور جس طرح اسے اجتماعی زندگی سے فرار پر مجبور ہونا پڑا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقوامِ مغرب کے قدموں کے نیچے اب وہ پتھر نہیں رہا جس کے باعث انکی سماجی زندگی قائم تھی یا جس پر وہ روحانی ضرورت کے لئے ٹیک لگاتے تھے۔کیتھولک عقیدے کے زوال سے لے کر Liberal Capitalism کے سفر میں اہل مغرب خود کو جس دنیا میں پاتے ہیں وہ حریت فکری، روشن خیالی اور اکرام آدمیت کی دنیا نہیں بلکہ Fascist Liberalism کا کریہہ منظر نامہ ہے جس کے بعد مغربی مفکرین نے سفر تاریخ کے خاتمے کا بگل بجا دیا ہے۔کمیونزم کے زوال اور سرد جنگ کے خاتمے کے بعد جن لوگوں کو یہ توقع تھی کہ امریکی معاشرے میں فکر ونظر کی وسعت اور انسانی آزادی کا جو تجربہ ہوا ہے اس کا دائرہ پوری دنیا تک پھیل جائے گا انہیں Capitalism کے انسانی mask کے پیچھے چھپے مکروہ چہرے سے سخت مایوسی ہوئی ہے۔انہیں اس خیال نے بھی لرزہ براندام کر دیا ہے کہ جنت نشاں امریکہ کی تابناک خوشحالی کے پیچھے مقہور و مجبور اقوام اور پسماندہ ممالک کا مسلسل نہ تھمنے والا استحصال ہے جس کے بغیر جنت نشاں امریکہ کی آب وتاب باقی نہیں رہ سکتی۔ ذرا غور کیجئے ہندوستان کے مقابلے میں امریکہ میں ایک تہائی آبادی رہتی ہے لیکن وہ پوری دنیا کے ایک تہائی سے بھی زیادہ وسائل اکیلے ہڑپ کر جاتا ہے۔اگر اہل ہندوستان بھی اسی پر آسائش زندگی پر مصر ہو جائیں تو ایسی صورت حال میں ہندوستان کے علاوہ کرۂ ارض کی تمام آبادی فاقوں کی تاب نہ لا کر دم توڑ دے گی۔سرد جنگ کے خاتمے کے بعد جنت ارضی امریکہ اور یورپ کے دوسرے پر تعیش معاشرے کو راست ایسے اقدامات کرنے پڑے ہیں جس سے ان کا لوٹ کھسوٹ ہر خاص و عام پر واضح ہو گیا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ مغرب کا بیدار مغز اور بیدار دل انسان بھی اس صورت حال پر اپنے اندر اضطراب محسوس کرتا ہے اور ان کی ایک قابل ذکر آبادی انسانوں کے استحصال اور ان کے اتلاف جان کی قیمت پر اپنی جنتِ ارضی کی چمک دمک کو برقرار رکھنا جائز نہیں سمجھتی ،انہیں صاف محسوس ہوتا ہے کہ جن خوشنما نعروں

کے بل بوتے پر وہ اپنے معاشرے پر فخر کرتے تھے انکی بنیادیں ہل گئی ہیں، وہ نہ صرف یہ کہ اندر سے احساس جرم میں مبتلا ہیں بلکہ اس مصیبت پر پریشان بھی کہ وہ خود کو Fascist Liberalism کے نرغے میں پاتے ہیں، ایک ایسا فاشزم جس نے تازہ بہ تازہ ایک ایسے نامانوس مذہب کو جنم دیا ہے جسے Evangelical Capitalism کہا جا سکتا ہے اور جس کے نعرے God bless America نے خدا کو بھی امریکا کی خدمت پر مامور کر دیا ہے۔

مغرب میں دنیا کو خودکشی سے دوچار کرنے کی تحریک روز افزوں اضافے پر ہے، ایسا اس لئے بھی کہ فاشسٹ کیپٹل ازم کو لگام دینے کے لئے اب بظاہر کوئی مؤثر قوت باقی نہیں رہ گئی ہے، کمیونزم کے زوال کے بعد مشرق میں روحانیت کے جو چھوٹے چھوٹے جزیرے نظر آرہے تھے اور جہاں فی زمانہ دنیا کے موجودہ صورت حال پر سخت اضطراب پایا جاتا ہے اسے قوت کے بل پر قابو میں لانے کی سرتوڑ جد و جہد جاری ہے۔ Globalization کے اسرار و عواقب نے واقعہ یہ ہے کہ پوری دنیا کو Capitalist Fascism کے پنجوں میں جکڑے جانے کی سہولتیں فراہم کر دی ہیں، گویا فاسسٹ اٹلی اور نازی جرمنی میں انسانوں کو اپنی بے بسی کا جو احساس مقامی سطح پر ہوا تھا کچھ یہی صورت حال اس وقت عالمی سطح پر کئی گنا شدت کے ساتھ پوری دنیائے انسانیت پر طاری ہے۔ اس پر طرفہ یہ کہ فاشسٹ Capitalism کے علمبردار اس صورت حال کو انسانی تاریخ کی معراج بتاتے ہیں، ان کے نزدیک تاریخ اپنے منطقی ارتقائی سفر کے بعد لبرل ڈیموکریسی کی منزل پر آ پہنچی ہے اور یہی تاریخ کی آخری منزل ہے۔

لیکن یہ تو صرف تصویر کا ایک رخ ہے، اہل فکر مسلمانوں کو اس مسئلہ پر سوچنے کی ضرورت ہے کہ آخر یہ سب کچھ کیسے ممکن ہوا کہ آخری امت کے ہاتھوں سے تاریخ کی لگام پھسلتی چلی گئی اور جنہیں اہل زمین کی نجات دہی کے لئے معمور کیا گیا تھا وہ خود اپنی موت و حیات کی عبرت ناک کشمکش میں گرفتار ہو گئے۔ اس بنیادی سوال کا جواب فراہم کئے بغیر مغرب کے مسلسل بڑھتے سیلاب پر روک لگانا ممکن نہیں۔

ہمیں اس بات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ گذشتہ چند صدیوں میں اسلام کا فکری سرمایہ مدافعت کی زبان میں کیوں لکھا گیا ہے، آخر کیا وجہ ہے کہ جو لوگ نظری طور پر دنیا کی قیادت کے لئے اٹھائے گئے تھے اور جنہیں آخری نبی کے متبعین کی حیثیت سے رحمت للعالمینی کا فریضہ انجام دینا تھا وہ خود کو اقوام عالم کے مقابلے میں ایک فریق کی حیثیت سے اس قدر دیکھنے کے عادی ہوئے کہ ان کی نفسیات پر مدافعت پوری طرح غالب آ گئی، تحریک دعوت یا تحریک رحمت کے حاملین تحریک مزاحمت کے ذہنی سانچے سے جب تک نہیں نکلتے ان کے لئے قرآن کے آفاقی پیغام سے فائدہ اٹھانا اور اسے بروئے کار لانا کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟

ہم اس صورت حال سے بھی صرف نظرنہیں کر سکتے کہ تمسک بالکتاب والسنۃ کے حاملین مغرب کی پیدا کردہ اس دنیا میں خود کو حاشیے پرمحسوس کرتے ہیں، قال اللہ وقال الرسول کی درسگاہیں خواہ اپنے بارے میں کتنے ہی اعلیٰ خیالات رکھتی ہوں واقعہ یہ ہے کہ جدید technological دنیا میں ان کا وجود بے محل ہوکررہ گیا ہے۔ اب دنیا کا ان پر انحصار نہیں بلکہ وہ دنیا پر انحصار کرنے پر مجبور ہیں۔ علوم کے سلسلے میں ہمارے تراشیدہ التباسات نے ہمیں تاریخ کے dustbin میں پناہ لینے پر مجبور کردیا ہے، اب جو لوگ اس صورت حال پر ماتم کناں ہیں اور شدت جذبات میں سب کچھ کرگزرنے کے لئے خود کو آمادہ پاتے ہیں انہیں اس سنگین صورت حال سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں دکھتا۔ قدیم علماء کی تعبیرات اور فقہاء کی تحریریں چونکہ مدافعت اور مزاحمت کے فکری سانچے میں تیار کی گئی ہیں اس لئے وہ شوقِ شہادت تو پیدا کرسکتی ہیں البتہ ان سے کوئی راستہ نہیں مل سکتا، رہے وہ لوگ جو قدماء پر انحصار کے بجائے ایک نئے راستے کے متلاشی ہیں تو ان کی بڑی اکثریت قرآنی دائرۂ فکر میں واپس جانے کے بجائے اپنے دل ودماغ پر انحصار کو کافی سمجھتی ہے، ایسا اس لئے بھی کہ ان کا دل ودماغ language of resistance میں لکھی گئی تحریروں کو قبول نہیں کرتا اور وہ خود language of mercy میں فہم قرآن کے منہج سے واقفیت نہیں رکھتے۔ پھر گذشتہ صدیوں میں مسلم معاشرے میں دین کے نام پر جو سیاسی تحریکیں اٹھیں ہیں اور جس کی وجہ سے دین کو ایک سیاسی نعرے کے طور پر استعمال کرنے کا رواج ہوا ہے اس نے بھی اہل فکر مسلمانوں کو قرآنی طریقہ فکر اختیار کرنے سے روک رکھا ہے۔ سیاسی تحریکوں نے شریعت کے حوالے سے فقہی زندگی کے احیاء کو کافی جانا اور وہ شریعت کو فقہ کا متبادل سمجھنے کی غلطی میں مبتلا رہے۔ نائجیریا یا پاکستان میں شریعت کے نام پر عملاً بعض مسالک کے فقہی نظام کے احیاء کی کوشش کی گئی اور اس عمل میں کسی نے اتنی بھی کوشش نہ کی کہ قرآن سے راست اکتساب کے ذریعے ان فقہی تعبیرات کا کم ازکم ایک بار محاکمہ کرلیا جاتا، جو لوگ شریعت کے نام پر حکمرانی کا حق مانگ رہے تھے انہوں نے اس کا موقع ہی کب دیا کہ شریعت ان کے نظام حکمرانی کا محاکمہ کرے وہ تو بس اتنا ہی کافی سمجھتے تھے کہ شریعت ان کی حکمرانی میں محض خدمت کا فریضہ انجام دے۔ پاکستان، افغانستان، نائجیریا جیسی جگہوں پر شریعت کے نام پر ہونے والے تجربوں نے خود اسلامی نظام کے سلسلے میں مایوسی کی ایک فضاء کو جنم دیا ہے۔

دوسری طرف بیسویں صدی کے نصف اول میں اٹھنے والی پرشور دینی تحریکیں بھی جس اسلامی نظام کے نعرے کے ساتھ سامنے آئی تھیں ایسا محسوس ہوتا ہے اپنی طبعی عمر کو پہنچ چکی ہیں۔ مصر اور پاکستان میں نظام مصطفیٰ کے حوالے سے ابھی تک کسی نظام رحمت کے بجائے مسلکی تشدد اور تنگ نظری کا منظرنامہ ہی آتا ہے، طالبان کے تجربے اور متحدہ مجلس عمل میں جماعت اسلامی کے کلیدی رول نے اس خیال کو مزید تقویت دی ہے کہ دینی تحریکیں ابھی تک عہد عباسی کے فقہی تصورات کو ہی دین کا ماحصل سمجھتی ہیں، وہ اس دانشورانہ چیلنج کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں کہ قرآنی نظامِ رحمت کی تعبیر مزاحمت اور مدافعت کی زبان سے پرے

بھی ہوسکتی ہے۔قرآن جہاں وسعت قلب ونظر کا داعی ہے وہیں فقہی اور مسلکی طرزِ فکر خود مسلم معاشرے کوایک خانہ جنگی میں مبتلا کردیتی ہے۔خود کو مستند مسلمان بتانے اور دوسروں کو دائرہ اسلام کی سرحد پر بھی جگہ نہ دینے کے رویے نے مختلف مسلم معاشرے کو ایک طرح کی خانہ جنگی میں مبتلا کررکھا ہے۔ پاکستان، تیونس، الجزائر، مصر جہاں بھی فقہی طریقہ تعبیر کے ذریعے مزاحمت کی زبان میں اسلام کے پیغام کو عام کرنے کی کوشش کی جارہی ہے مسلم معاشرہ ایک طرح کی خانہ جنگی سے دوچار ہے۔ کچھ یہی حال عصر حاضر کی نئی سلفی تحریک کا ہے جس نے ماضی میں اوہام پرستی اور آباء پرستی کو لگام دینے میں بڑا رول انجام دیا ہے لیکن اب یہاں بھی ابن تیمیہ اور محمد بن عبدالوہاب کو احبار کے درجے پر فائز کردینے سے سلف صالح کے حوالے سے ﴿وجدنا آباءنا کذلك یفعلون﴾ کی فضا عام ہے۔

گویا دنیا اگر ایک طرف Capitalist Fascism کے نرغے میں ہے تو دوسری طرف دنیا کے آخری نجات دہندوں پر اپنے مقصد سے بے شعوری اور کارِ نبوت سے بے خبری کی فضا عام ہے۔انسانی تاریخ آج جہاں اندھی گلی میں پھنسی محسوس ہوتی ہے اور جسے مغربی مفکرین تاریخ کی آخری منزل قرار دیتے ہیں وہ دراصل انسانی تاریخ کا انحراف ہے جس کی بنیادی وجہ متبعین محمد ﷺ کی اپنے منصب امامت سے خود اختیار کردہ معزولی ہے۔قرآن مجید کی موجوگی کے باوجود غیر قرآنی ماخذ پر امت کا غیر معمولی انحصار اور کتاب ہدایت کے بجائے کتب فقہ پر مشتمل آراء الرجال کو مشعل حیات قرار دینے کے سبب، واقعہ یہ ہے کہ آج پوری امت دینِ آباء کی اسیر ہوکر رہ گئی ہے۔وحی کے گرد تشریحات وتاویلات، قصص وتاریخ، روایات وکشف کے پہرے اتنے سخت ہیں کہ اب کتاب ہدایت سے راست اکتساب کا چیلنج قبول کرنے کے لئے وہ لوگ بھی آمادہ دکھائی نہیں دیتے جنھوں نے اپنی عمر عزیز کو علوم دین کے حوالے سے وقف کررکھا ہے اور جن سے بجا طور پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ امت کو اور اس سے آگے بڑھ کر پوری دنیائے انسانیت کو اس اندھی گلی سے نکالنے میں قائدانہ رول ادا کریں گے۔ مطالعہ قرآنی کے سلسلے میں ہم عرصے سے جس منہج کے اسیر ہیں، جسے سید قطب کی اصطلاح میں المنطق الوجدانی کہا جانا چاہئے، اس نے تفکر وتدبر سے کہیں زیادہ عقلی رویے کی بیخ کنی کی ہے۔سلف اور قدماء کی فہم پر غیر معمولی انحصار بلکہ انہیں دلیل اور حکم قرار دے لینے کے نتیجے میں ہم قرآن کے سلسلے میں صدیوں سے ایک ایسی صورت حال میں مبتلا ہیں جسے Kant کی اصطلاح میں 'self imposed immaturity' سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔نتیجہ یہ ہے کہ وحی کے سلسلے میں ہمارا تجربہ ایک ایسی روشنی کا ہے جس نے کوئی چودہ صدیوں پہلے اہل ایمان کے ایک گروہ کو غیر معمولی تقلیب فکر ونظر سے دوچار کردیا تھا، فکر ونظر کا یہ انقلاب ہمارے لئے ماضی کی ایک مقدس داستان ہے، ہم فی نفسہ اس تجربے سے ناآشنا ہیں۔ گویا قرآن کی حیثیت اور اس کا عملی رول ہمارے درمیان روشنی کی ایک داستانِ سابقہ کی ہے، روشنی کی نہیں۔اور یہ وہ صورت حال ہے جس نے صدیوں سے پوری امت کو روشنی سے ظلمت کی طرف ایک سفر معکوس میں مبتلا کر

رکھا ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو اگر پچھلی قومیں وحی سے بے اعتنائی برتنے کے نتیجہ میں گمرہی میں مبتلا ہوسکتی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان قرآن مجید سے مجرمانہ غفلت برتنے کے باوجود روشنی سے اندھیرے کی طرف انخلاء پر مجبور نہ کئے جائیں۔

ظلمت کا عذاب جب شدید ہو جائے تو ڈر اور خوف اس کا لازمہ بن جاتا ہے۔ وحی کی روشنی جب ساتھ چھوڑ دے تو آنکھیں منزل کی نشاندہی کیسے کرسکتی ہیں: ﴿ذهب الله بنورهم و تركهم في ظلمات لا يبصرون﴾ (البقرة:۱۷) ڈر، خوف جس سے انسانی وجود لرز جاتا ہوا ان قوموں کا خاص شعار ہے جو بوجوہ وحی الٰہی سے تہی دامن رہ گئے ہوں: ﴿أو كصيّب من السماء فيه ظلمات و رعد و برق﴾ (البقرة:۱۹) ظلمت کا یہ عذاب انہیں ایک ایسی صورت حال سے دوچار رکھتا جسے قرآن نے ﴿يكاد البرق يخطف أبصارهم﴾ کہا ہے یعنی ایک ایسی صورت حال جب روشنی بصیرت دینے کے بجائے بصیرت سلب کر لیتی ہو، اس روشنی میں وہ چند لمحے چلتے پھرتے اور پھر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس قرآنی بیان کی روشنی میں دیکھئے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چند الفاظ میں موجودہ امت مسلمہ کی تصویر کشی کر دی گئی ہو۔

صورت حال کی سنگینی اس بات کی طالب ہے کہ امت مسلمہ کے سفر معکوس پر فی الفور روک لگائی جائے۔ ماضی میں اس کارِ عظیم کو انجام دینے کے لئے انبیاء کو مبعوث کیا جاتا تھا، اس میں شبہ نہیں کہ اس کام کی عظمت اور اس چیلنج کی شدت کم از کم ایک نبی کا مطالبہ تو ضرور کرتی ہے۔ جو لوگ آخری نبی کے آجانے کے بعد بھی کسی مسیحا، مہدی، امام غائب یا مسیح موعود کے منتظر ہیں ان کے ذہنوں پر اس کارِ عظیم کا یہی چیلنج ہے، البتہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ محمد رسول اللہ کی شکل میں انسانی تاریخ کے آخری نبی کا ظہور ہو چکا ہے اور جو آپ ﷺ پر نازل ہونے والے غیر محرف صحیفہ کی اصل عظمت سے آشنا ہیں ان کے لئے اس خیال کو تسلیم کرنے میں ذرہ برابر بھی تکلف نہیں ہونا چاہئے کہ غیاب محمدی میں تاریخ کے انحراف کی درستگی نہ صرف یہ کہ ممکن ہے بلکہ مطلوب بھی۔ قرآن مجید جب تک اپنی اصل آب وتاب اور غیر محرف شکل میں باقی رہے گا، غیاب محمدی یا غیاب نبی میں ہر لمحہ ایک نئی روشنی کے طلوع کا امکان عین ممکن قرار پائے گا۔ گویا دنیا کو ایک نئے Enlightenment سے آشنا کرنے کا امکان تاریخ کے ہر لمحے میں حاملین قرآن کی دسترس میں ہوگا۔

نئے دور کی ظلمت جس میں آج پوری دنیائے انسانیت مبتلا ہے اور جس سے متبعین محمد کو بھی وافر حصہ ملا ہے اوہام پرستی یا اصنام پرستی نہیں بلکہ ایک طرح کی بے حسی، بے خبری بلکہ casual اندازِ فکر ہے جو دراصل چیزوں کی اصل ماہیئت کے غیاب سے پیدا ہوئی ہے۔ ماضی کے مقابلے میں یہ نئی صورت حال کہیں سنگین ہے، دعائے محمدی اللّٰهم أرني الأشياء كما هي کی اتنی شدید حاجت شاید تاریخ میں اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی ہو۔ چیزوں کی اصل ماہیئت کے ادراک کے بغیر نہ تو صحیح محاکمہ ہوسکتا ہے اور نہ ہی مستقبل کے لئے کوئی راستہ مل سکتا ہے، اور یہ کام غیاب محمدی میں قرآن مجید کے ذریعے ہی انجام پائے گا کہ قرآن

مجید ایک ایسی کتاب ہے جو کامل ہدایت کا اعلامیہ ہے۔ ﴿ما فرطنا في الكتاب من شيئ﴾ (الأنعام : ۳۸) یہ سراسر روشنی اور کتاب مبین ہے (مائدہ: ۱۵) دنیا کو ایک نئے Enlightenment سے آشنا کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ پوری امت آباء پرستی اور اسلاف پرستی سے دست کش ہو کر خدا اور اس کی کتاب کا دامن تھام لے کہ وہ اللہ ہی ہے جو اہل ایمان کو تاریکی سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاتا ہے (بقرہ: ۲۵۷) اور بے شک یہ اسی کی ذات ہے جس نے اپنے بندے پر واضح آیات اتاری تا کہ ظلمت میں پھنسا انسانی قافلہ روشنی کی طرف سفر کر سکے ﴿هو الذي ينزل على عبده آيت بينٰت ليخرجكم من الظلمات الى النور﴾ (الحدید: ۹) اگر آج بھی حاملین قرآن وحی ربانی کا راست چیلنج قبول کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں تو وہ اندھیروں سے روشنی کے اس سفر میں اپنی پشت پر تائید ایزدی کو پائیں گے جیسا کہ ارشاد ہے ﴿هو الذی يصلی عليكم و ملئكته ليخرجكم من الظلمات الى النور و كا ن بالمؤمنين رحيما﴾ (الاحزاب: ۴۳)۔ اندھیرا کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو حاملین قرآن کے لئے تاریخ کے ہر لمحے میں ایک نئی صبح کی بشارت دینا عین ممکن ہے حتیٰ کہ آج بھی جب ہم ایک اندھی گلی میں پھنس گئے ہیں جب ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اپنی لغزشوں کی پاداش میں ہم مثل حضرت یونس خود کو مچھلی کے تنگ و تاریک پیٹ میں بے بس محسوس کرتے ہوں اور اس صورت حال سے نجات کے تمام امکانی دروازے بند ہو گئے ہوں تب بھی ایک نئے Enlightenment، ایک نئی ابتداء ہمارے دروں پر دستک دے رہی ہے شرط یہ ہے کہ ہم بھی مثل یونس اپنی غلطیوں کے اعتراف کا حوصلہ رکھتے ہوں: ﴿فنادیٰ فی الظلمات ان لا اله الا انت سبحانك انی كنت من الظالمين﴾ (الانبیاء: ۸۷)۔

خدا کے علاوہ انسانوں کے کسی گروہ کو اس بات کا اختیار نہیں دیا جا سکتا کہ وہ اجماع کا دھونس دے کر یا اہل حل وعقد کے حوالے سے ہمیں کسی مسئلہ پر تحلیل و تجزیے سے باز رکھے۔ یہ رویہ قرآن کے rational discourse کے خلاف ہے۔ جب اللہ تعالیٰ خود توحید کے بنیادی اعتقادات کو ہمیں عقلی استدلال کے ذریعہ باور کرانا چاہتا ہے اور جب قرآن اپنے ماننے والوں سے اس بات کا طالب ہے کہ وہ تحقیق و تجزیہ کے ذریعہ اشیا کی ماہیئت تک پہونچنے کی کوشش کریں تو پھر عام انسانوں کو یہ حق کیسے دیا جا سکتا ہے کہ وہ اکثریت کے حوالے سے یا وجدنا آباء نا کذلک یفعلون کے سہارے ہمیں کسی مسئلہ کو طے شدہ یا closed for discussion باور کرائیں۔

عرصے سے حکمائے اسلام نے عقل اور وحی کو ایک دوسرے کی ضد سمجھ رکھا ہے۔ مسلم متکلمین مشاہدے کے مقابلے میں وجدانی علوم کے تفوق کے قائل رہے ہیں۔ اس لئے ان کے یہاں مشاہداتی علوم کے سلسلے میں ایک طرح کی بے توقیری کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن مجید، جو مسلمانوں میں وجدانی علوم کا بنیادی ماخذ ہے، تدبر و تفکر اور مشاہدے کی بھرپور وکالت کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وجدان کی عمارت تعقل کی بنیادوں پر رکھی جائے۔ بھلا جو وجدان عقل کو قائل نہ کر سکے یا جو دانش انسانی کی پہنچ سے باہر ہو اسے انسانوں کے لئے مشعل راہ کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟

امت مسلمہ کی تشکیل نو

اسلام پوری انسانیت کے لئے خدا کا پسندیدہ دین ہے اور محمد رسول اللہ کافۃ للناس بشیرا و نذیرا اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ اسلام کی یہ دعوت جسے آخری نبی اور ان کے سچے متبعین کے ہاتھوں تاریخ کے آخری لمحے تک انسانیت کی رہنمائی کرنی ہے کسی قومی یا ملی شناخت کا نام نہیں بلکہ غیر مشروط سپردگی کے اس والہانہ رویے کا نام ہے جس کا اظہار انسانی تاریخ میں تسلسل اور ترتیب کے ساتھ انبیائے کرام کے ذریعے ہوتا رہا ہے۔ دنیا کے مختلف خطوں میں تاریخ کے مختلف ادوار میں، تمام ہی انبیاء انسانوں کو غیر مشروط عبودیت کی دعوت دیتے رہے ہیں۔ اب جب سلسلۂ رسالت اپنے اختتام کو پہنچ چکا ہے، سپردگی کی اس تحریک کو اپنے انجام تک پہنچانے کی ذمہ داری محمد رسول اللہ کے متبعین پر عائد کی گئی ہے۔ البتہ کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ انبیائے سابقین کی دوسری امتیں یا متقین کے دوسرے گروہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اس عظیم نبوی تحریک سے باہر کر دیئے گئے ہوں۔ بات صرف اتنی ہے کہ آخری وحی کے حاملین کی حیثیت سے جہاں متبعین محمد کو کلیدی اور مرکزی کردار ادا کرنا ہے وہیں دوسری اقوام کے متبعین کو بھی اس انبیائی تحریک میں اپنی بساط بھر شریک ہونا ہے کہ انسانیت کی فلاح کا کوئی وسیع پروجیکٹ وسعتِ نظری اور وسعت قلبی کے بغیر انجام نہیں پا سکتا۔ اگر اسلام کی دعوت سے مراد کسی خاص لسانی، قومی، جغرافیائی یا ملی گروہ کا غلبہ نہ ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ انسانیت کی سعید روحیں خواہ وہ دنیا کی کسی قوم یا ملت میں پائی جاتی ہوں اس تحریک میں اپنے اندر والہانہ شرکت کا داعیہ محسوس نہ کریں۔

قرآن کا ایک معمولی طالب علم بھی اس حقیقت سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا کہ ابراہیمؑ سے لے کر محمدؐ تک اس دنیا میں انبیاء کے ذریعے انسانوں کو جس بات کی طرف بلایا جاتا رہا ہے وہ خدا کے آگے غیر مشروط سپردگی کی یہی دعوت ہے جسے ہم اسلام سے موسوم کرتے ہیں۔ ابراہیم، اسحٰق و اسمٰعیل بنی اسرائیل کے تمام انبیاء اور دیگر اقوام کی طرف بھیجے جانے والے نبی حتیٰ کہ وہ بھی جن کا تذکرہ قرآن میں موجود نہیں ہے، ایک ہی دین کے امین اور مبلغ رہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ان کے حوالے سے مسلم ذہنوں میں کسی قسم کے گروہی تعصب کا داعیہ پیدا ہو۔ قرآن مجید کی یہ تنبیہ کہ اہلِ ایمان انبیاء کے سلسلے میں ﴿لا نفرق بین احد من

رسلہ﴾ (البقرۃ:۲۸۵) کے رویے پر عامل ہوتے ہیں، دراصل اسی بات کو ذہن نشین کرانا ہے کہ خانوادۂ نبوت کے تمام ہی عالی مقام حاملین ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ ایک کی شخصیت یا دعوت دوسرے سے متصادم یا متعارض نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محمد رسول اللہ کے متبعین کے لئے اس بات کو لازم کیا گیا کہ وہ نہ صرف اس کتاب پر ایمان لائیں جو محمدؐ کی طرف بھیجی گئی ہے بلکہ ان تمام سابقہ کتب اور انبیاء کو بھی اسی نبوی تحریک کا حصہ سمجھیں جن کے باقیات دنیا کے مختلف خطوں میں پائے جاتے ہیں۔ گویا آخری رسولؐ کی بعثت سے کسی نئے دین کی داغ بیل نہیں ڈالی جارہی ہے اور نہ ہی قرآنی وحی کسی نئی ابتداء کا سامان ہے بلکہ یہ پچھلوں کی تصدیق کرنے اور باقیات امم سابقہ کے ورثے کو سمیٹتے ہوئے، بنیادی باتوں پر ان کو اشتراکِ عمل کے ذریعے ایک ایسے عالمی انقلاب کی بنیاد رکھنے جارہی ہے، جس میں تمام ہی انبیائے سابقین کی دعوتوں کی بازگشت سنی جاسکتی ہے۔

محمد رسول اللہ نے کسی نئی امت کی بنیاد نہیں رکھی اور نہ ہی اپنے متبعین کو کسی نئے گروہ سے موسوم کیا۔ قرآن کا انداز دعوت اس نکتہ کی مسلسل وضاحت سے عبارت ہے کہ محمد رسول اللہ کسی نئی امت کے قیام کے بجائے اطاعت گزاروں کے اسی خانوادے کے احیاء کیلئے تشریف لائے ہیں جن کی باقیات مختلف شکلوں میں اس سرزمین پر موجود ہے اور جن کا نظری وفکری ماحصل اب صرف یہی رہ گیا ہے کہ وہ انبیائے سابقین سے اپنا نسلی یا مذہبی رشتہ بتاتے رہیں اور اسے اپنی نجات کے لئے کافی سمجھیں۔

﴿وقالوا كونوا هودًا أو نصارىٰ﴾ کے جواب میں یہ کہا جانا کہ ﴿قل بل ملة ابراهيم حنيفا﴾ (البقرۃ:۱۳۵) دراصل اسی وسعت فکری کا اظہار تھا کہ آخری نبی کسی نئی امت کے قیام کا داعی نہیں بلکہ امت ابراہیمی کا احیاء کرنے والا ہے اور اسکی دعوت تمام انبیائے سابقہ کی دعوتوں کا ارتکاز ہے: ﴿قل انني هداني ربي الى صراط مستقيم دينا قيماً ملة ابراهيم حنيفا﴾ (الأنعام:۱۶۱)۔ قرآن مختلف اسالیب میں بار بار اس حقیقت کو ذہن نشین کراتا ہے کہ متبعین محمد کو جو کچھ عطا ہوا ہے یہ وہی دین ہے جو اس سے قبل انبیائے سابقین لاتے رہے ہیں: ﴿شرع لكم من الدين ماوصىٰ به نوحاً والذى اوحينا اليك﴾ (الشوری:۱۳)۔ دین ابراہیمی کے سابق دعویدار انبیائے سابقین کے متبعین سے باسالیب مختلف یہ بات کہی جاتی رہی کہ فی زمانہ دین ابراہیمی کا امین محمدؐ کے علاوہ اور کون ہوسکتا ہے: ﴿ ان أولى الناس بابرٰهيم للذين اتبعوه وهذاالنبىّ والذين آمنوا ﴾ (آل عمران:۶۸)۔ رہے وہ لوگ جو محمدؐ پر ایمان لے آئے ہیں تو انہیں جان لینا چاہیے کہ وہ نئے نبی کی قیادت میں اسی دین پر کاربند ہیں جس کے بابت انہیں اس سے پہلے توراۃ وانجیل میں انہیں بتایا جاچکا ہے۔ ﴿الذين يتبعون الرسول النبى الامى الذين يجدونه مكتوباً عندهم فى التورة والانجيل﴾ (الاعراف:۱۵۷) محمد رسول اللہ انبیائے سابقین کی جس وراثت کے امین ہیں اور جس مشن کو خوشگوار انجام تک پہنچانے کی ذمہ داری آپ پر عائد کی گئی اس سے فطری طور پر یہ بات مترشح ہوتی تھی کہ آخری نبی کسی خاص نسل، گروہ یا جغرافیائی سرحدوں میں رہنے والے انسانوں کے لئے مبعوث نہیں ہوا

ہے بلکہ اس کے پیش نظر عام انسانیت کی فلاح ہے۔ کسی ایسے بین الاقوامی نبی سے، جس پر آنے والی پوری تاریخ کا انحصار ہو، یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنی کوئی الگ امت بنائے گا اور صرف اس کی فلاح ونجات کو اپنا ہدف قرار دے لے گا۔ دین ابراہیمی کے سچے وارث کی حیثیت سے محمدؐ رسول اللہ بھلا ایسا کیسے کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم تاریخ کے ابتدائی ایام میں کسی گوشہ سے امت محمدیہ کی اصطلاح سننے میں نہیں ملتی۔ محمدؐ ہی پر کیا موقوف دنیا کے کسی نبی نے بھی اپنی ذات کی بنیاد پر کسی امت کی تشکیل کی کوشش نہیں کی۔ یہودی، نصرانی، بدھشٹ جیسی شناختیں بہت بعد کی پیداوار ہیں جو اپنے داعیوں کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ان کے متبعین نے ایجاد کر ڈالیں۔ نبی کا یہ مقام نہیں کہ وہ وحدت آدمیت کو ٹکڑوں میں بانٹے یا خدا کی طرف بلانے کے بجائے اپنی شخصیت پرستی کی دعوت دے۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ جس شخص کو خدا کتاب وحکمت اور نبوت سے سرفراز کرے وہ لوگوں سے یہ کہتا پھرے کہ لوگو میری شخصیت پرستی میں مبتلا ہو جاؤ کونوا عبادی (۷۹:۳) تمام انبیاء کی طرح محمد رسول اللہ کی دعوت بھی ﴿کونوا ربّٰنین﴾ سے عبارت ہے۔ ایک ایسی دعوت جس پر ابراہیم واسمٰعیل، اسحٰق ویعقوب، ان کی نسلیں، موسیٰؑ وعیسیٰؑ اور دیگر تمام انبیاء شہادت دیتے رہے ہیں۔ جو لوگ محمد پر ایمان لائے ان کے لئے تکمیل ایمان کی شرط کے طور پر یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ وہ ان انبیاء میں کوئی فرق نہیں کرتے ﴿لانفرق بین احد منهم ونحن له مسلمون﴾ (آل عمران: ۸٤)۔

﴿کونوا ربّٰنین﴾ کی دعوت جب اپنے محور سے ہٹ جاتی ہے اور دین داری کے نام پر گروہی عصبیت یا انبیاء اور ان کے سرکردہ متبعین کی شخصیت پرستی جزو دین قرار پاتی ہے تو دراصل اس Process کا آغاز ہو جاتا ہے جسے ہم دین کے حوالے سے دین کی نفی کا نام دیتے ہیں۔ یا جسے عرف عام میں مذہب، مسلک یا رسومِ عبودیت کا نام دیا جاتا ہے۔ پھر دین رویۂ سپردگی کے بجائے شناخت قرار پاتا ہے۔ امتیں اپنے انبیاء کی شاندار تاریخ اور اس سے اپنے تعلق کو وجہ نجات قرار دے لیتی ہیں۔ اہل یہود ونصاریٰ کی ان خوش گمانیوں کا قرآن میں بکثرت بیان ملتا ہے کہ کس طرح یہ لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ان کا یہودی یا عیسائی ہونا ان کی نجات کیلئے کافی ہے۔ قرآن نے شناخت یا نسبت کی بنیاد پر نجات کے خیال کو مسترد کر دیا اور یہ بات واضح کر دی کہ ﴿قل یاهل الکتاب لستم علی شئی حتی تقیموا التوراة والانجیل﴾ (المائدة:٦٨)۔ رہی یہ بات کہ ربانیوں کا یہ گروہ جو نئے نبی کی قیادت میں نجات کا طالب ہے اپنے لئے جو بھی شناخت اختیار کرے تو جس طرح وقت کے مسلمانوں (اہل یہود ونصاریٰ) کی انبیائی نسبتیں ان کی نجات کیلئے کافی نہیں ہوسکتیں اور یہ دعویٰ صحیح نہیں ہوسکتا کہ ابراہیم واسمٰعیل اور اسحٰق ویعقوب یہودی یا نصاریٰ تھے۔ اسی طرح کوئی یہ نہ سمجھے کہ محمدؐ کوئی نئی شناخت یا نیا گروہ بنانے آئے ہیں یا ایسی کوئی شناخت ان کے متبعین کے لئے وجہ نجات ہوسکتی ہے۔ شناخت کی بنیاد پر نجات کے اس جھگڑے کا فیصلہ یوں کر دیا گیا کہ خدا کے نزدیک اہمیت عمل کی

ہے﴿ولنآ اعما لنا ولکم اعمالکم ونحن له مخلصون﴾ (البقرۃ:۱۳۹)۔ان تمام غیر معتبر شناخت کے مقابلے میں نئے نبی کی قیادت میں ربانیوں کا جو گروہ تشکیل پایا ہے اس سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ گروہ بندی اور فرقہ پرستی سے اوپر اٹھ کر اپنے لئے ایک خدائی شناخت کو منتخب کرے﴿صبغة الله ومن احسن من الله صبغة﴾ (البقرۃ:۱۳۸)۔یہودی یا عیسائی شناختوں کے مقابلے میں اگر ایک نئی محمدی شناخت وجود میں آجاتی تو یہ سب کچھ ایک عالمی ربانی پیغمبر کے شایان شان نہ ہوتا جو بیک وقت تمام پچھلے انبیاء، ان کی کتابوں پر ایمان کو لازم قرار دیتا ہو اور جو سابقین اور ان کی باقیات کو اپنا فطری حلیف گردانتا ہو۔

ربّانی بنام محمدی

متبعین محمد کی ابتدائی نسلیں جب تک ربانی شناخت سے متصف رہیں ان کے فکر و نظر پر یہ خیال غالب رہا کہ وہ دینِ ابراہیمی کی نقیب اور تمام انبیائے سابقہ کی وراثتوں کی امین ہیں۔ان کی پیش قدمی مانند سیل رواں جاری رہی۔گم گشتہ انسانیت کے قافلے، انبیائے سابقین کے باقیات جوق در جوق آخری نبی کی ربانی تحریک میں شامل ہوتے رہے۔عام انسانوں کو ایسا لگتا تھا جیسے اس ربانی تحریک کے دروازے ان پر وا ہیں۔یہ تحریک کسی مخصوص گروہ یا قوم کی سبقت یا بالادستی کی دعوت نہیں دیتی بلکہ اس کی وسعت میں پوری دنیائے انسانیت کی نجات کا سامان موجود ہے۔خدائے واحد کی غیر مشروط بندگی کی یہ دعوت دنیائے انسانیت کو ایک دھاگے میں پروتی اور اسے ایک رشتۂ اخوت میں متحد کرتی۔اطاعت گزاروں کا یہ قافلہ جس میں تمام ہی انبیاء اور ان کے سچے متبعین شامل بتائے جاتے تھے وحدت انسانیت کی ایک ایسی آفاقی دعوت تھی جس سے ہر ذی شعور شخص خود کو منسلک محسوس کرتا۔

تمام گروہی شناخت کی نفی اور ربانی شناخت پر اصرار کا ہی نتیجہ تھا کہ متبعین محمد کی پہلی نسل بادیہ نشین عربوں کے بے سرو سامان قافلے جب مختلف سمتوں میں اس صدائے انقلاب کو لے کر نکلے تو عرب وعجم، شمال وجنوب ہر جگہ ان کا والہانہ استقبال ہوا۔عام انسانوں نے ان بادیہ نشینوں کو اپنا نجات دہندہ تصور کیا۔انہیں اس کا خیال بھی نہ آیا کہ ربانی دعوت کے ان علمبرداروں کا تعلق کسی اجنبی تہذیب سے ہے، ان کی زبان مختلف اور ان کا طرزِ زندگی عرب ثقافت کا امین ہے کہ داعی اور مدعو دونوں کے لئے زبان وثقافت، رنگ ونسل کا امتیاز، جغرافیائی سرحدیں اپنی معنویت کھو چکی تھیں۔تب ربانی تحریک میں ہر شخص خواہ وہ عرب ہو یا عجم اپنی شرکت کے یکساں مواقع دیکھتا تھا اور اپنی نجات کے لئے یکساں امکانات پاتا تھا۔مشترکہ پیغمبرانہ وراثت کے یہ امین جو عالمی سطح پر ایک ربانی معاشرے کے قیام کی دعوت لے کر اٹھے تھے، ابتدائی دنوں میں ربانی نظام زندگی کی ایسی نظیر قائم کی جس پر

نہ تو کسی خاص ثقافت کے غلبہ کا گمان ہوتا تھا اور نہ ہی کسی امپائر سازی کا شبہ کہ متبعین محمد کی پہلی نسل اپنے طرز عمل سے امپائر بلڈنگ کی نفی کرتی رہی۔

البتہ رفتہ رفتہ جب قرآن کا آفاقی پیغام اور وحدتِ انسانیت کی دعوت نگاہوں سے اوجھل ہوتی گئی، ربانی پیغام عرب ثقافت کے قالب میں دیکھا جانے لگا اور ہمارے علماء ودانشور اس خیال کے قائل ہوتے گئے کہ مسلم ثقافت دراصل قرآنی دائرہ فکر کا ہی فکری تسلسل ہے اور یہ کہ اسلام کے مفاد کو مروجہ مسلمانوں سے الگ نہیں کیا جاسکتا، ہمارے یہاں ربانی طرزِ فکر کے زوال کا بگل بج گیا۔ عرب ثقافت فی نفسہٖ وجہ امتیاز قرار پائی اور غیر عربوں کو موالیوں کی شکل میں ربانی تحریک کی سرحد پر اکتفا کرنا پڑا۔ جب ایک بار ربانی دعوت کے بجائے خاندانی عزّ وشرف، نسلی تفاخر اور عرب عصبیت جیسے عوامل کو اہمیت مل گئی تو پھر ربانیوں کے اس گروہ سے صبغۃ اللہ کا وہ مجموعی تاثر زائل ہوتا گیا۔ دیگر اقوام کے مقابلے میں مسلم قومی عصبیت ایک معتبر شناخت کی حیثیت سے سامنے آئی۔ خانوادۂ نبوت کے دوسرے گروہ اور سعید نفوس کے دیگر قافلے خود کو اس نئی مسلم تحریک سے الگ محسوس کرنے لگے۔ جن لوگوں نے محمد رسول اللہ کی بعثت کے بعد بھی اپنی یہودی، عیسائی جیسی شناختوں کو باقی رکھا تھا ان کی تنگ نظری اور فرقہ پرستی تو عیاں تھی البتہ اب نئی مسلم قومی عصبیت کے سامنے آجانے سے خود ربانیوں کا یہ گروہ بھی فرقۂ محمدی کی نفسیات سے دوچار ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بین الاقوامی رسول کو جو عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے ایک مسلم قومی نجات دہندہ کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا۔ پھر بہت جلد توحید کے ان علمبرداروں میں بھی اقوام سابقہ کی طرح، اپنے نبی کے حوالے سے گروہی شناخت کے داعیے نے سر اٹھایا۔ توحید کی علمبردار امت جو کبھی خدائے واحد کی بنیاد پر وحدت انسانیت کی علمبردار تھی اور جس کے دل ودماغ اس احساس سے معطر رہتے کہ وہ تمام انبیاء ورسل کی دعوتوں کا ارتکاز ہیں۔ بدقسمتی سے وہی لوگ خود کو امت محمدی کا علمبردار سمجھنے لگے۔ اس تنگ نظری نے انہیں صرف منصبِ نبوت سے ہی معزول نہیں کیا بلکہ آخرت کے سلسلے میں بھی بے شمار خوش گمانیوں اور امانیات نے ان کے عقیدے میں مستقل اپنی جگہ بنالی۔

بھلا قرآن مجید سے بڑھ کر اور کون سا مستند وثیقہ ہوسکتا ہے جو محمد رسول اللہ کی غایتِ بعثت کی تشریح وتعبیر کرسکتا ہو۔ دفتین کی اس کتاب میں، جو آج تک پوری صحت کے ساتھ امت کو منتقل ہوتی رہی ہے، امت محمدیہ جیسی کوئی اصطلاح نہیں پائی جاتی۔ اس کے برعکس قرآن مجید میں رسول اللہ کو ایک ایسے نبی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے جو دینِ ابراہیمی کے احیاء کے لئے بھیجا گیا ہو اور جو اہلِ کتاب کے دیگر گروہوں کے مقابلے میں دینِ ابراہیمی کا سب سے مستند پیروکار ہے۔

امت محمدی کا نوتراشیدہ تصور اس بات سے عبارت تھا کہ اب تاریخ کے آخری لمحے تک صبغۃ اللہ کے حاملین کے بجائے ایک ایسی قوم اپنے غلبہ اور سیادت کی تیاری کررہی ہے جو محمد رسول اللہ کی باقیات میں سے ہے۔ ظاہر ہے دوسری اقوام کے لئے

امت محمدی کے سیاسی غلبہ یا اس کی عالمی قیادت میں کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی تھی۔ پھر آنے والے دنوں میں اس قومی شناخت کی بنیاد پر اموی اور عباسی سلطنتوں کے جاہ وحشم، اسپین اور دہلی میں امت محمدیہ کے سیاسی عروج اور عثمانی ترکوں کی قیادت میں ملک گیری کی توسیع کا جو منظر سامنے آیا اس سے بھی یہی کچھ مترشح ہوتا تھا کہ امتِ محمدیہ دوسری اقوام پر اپنے سیاسی، عسکری اور تہذیبی تفوق کیلئے کوشاں ہے۔ بظاہر مسلم ریاستوں کی سرحدیں وسیع ہوتی رہیں، عرب مسلم تہذیب وثقافت کے مرکز میں علم وفن کے چراغ کی لو مسلسل تیز ہوتی رہی، مگر فی الواقع نظری اعتبار سے متبعین محمد کی یہ نسلیں مسلسل زوالِ فکر ونظر سے دوچار تھیں، جہاں منصب ِ کاررسالت سے منہ موڑ کر اب ان کے ارباب حل وعقد اپنی کھال میں مست تھے۔ گروہی اندازِ فکر نے خود بین المسلمین خانہ جنگی کی کیفیت پیدا کردی تھی۔ جو لوگ کبھی وحدتِ انسانیت کے علمبردار تھے اب وہی لوگ آپس میں شیعہ سنی، حنفی شافعی شناختوں کے حوالے سے خونریز تصادم میں مبتلا ہو گئے۔ اس صورتِ حال نے اموی سلطنت کی بساط لپیٹ دی، عباسی سلطنت کا چراغ گل کردیا۔ نظری اعتبار سے امت اتنے مختلف گروہوں میں بٹ گئی کہ یہ پتہ لگانا مشکل ہوگیا کہ حق پر کون ہے اور کسے واقعی محمد رسول اللہ کا سچا امین کہا جاسکتا ہے۔ اہل فکر ونظر مسلسل اس خیال کا اظہار تو کرتے رہے کہ ہمارے تاریخی سفر میں کہیں کوئی بنیادی گڑبڑی ہوگئی ہے، جس کی وجہ سے ہر اگلا قدم ہمیں اپنی منزل سے مزید دور کردیتا ہے۔ مگر اصلاح احوال کے لئے جتنی بھی کوششیں ہوئیں ان کا لب لباب یہی تھا کہ امتِ محمدی کو کسی طرح غلبہ وتفوق عطا کردیا جائے۔ اس خیال کی طرف توجہ کم ہی گئی کہ ربانی امت کا جو تصور ہمارے دل ودماغ سے محو ہو چکا ہے اور جس کی وجہ سے ہم گروہی انداز سے سوچنے اور محدود گروہی نتائج پیدا کرنے پر مجبور ہیں، اس آفاقی نقطۂ نظر کی ازسرِ نو تشکیل کا کام کیسے انجام دیا جائے۔

امت مسلمہ کے وسیع آفاقی تصور سے دست کشی اور امتِ محمدی کے نئے نظری خول کی تعبیر نفسیاتی اور فکری ہر دو سطح پر پسپائی سے عبارت تھی، جس نے بہت جلد متبعین محمد کی اگلی نسلوں کو منصبِ سیادت سے معزول ومعطل کرکے رکھ دیا۔ جب تک مسلمانوں کی موجودہ نسل کو کارِ نبوت کے اعلیٰ منصب کا پھر سے ادراک نہیں ہوتا اور ان کے دل ودماغ اس خیالِ تقلیب انگیز سے مامور نہیں ہوتے کہ وہ رحمۃ للعالمین کے امین، تمام انبیائی تحریکوں کے نکتہ ارتکاز اور تاریخ کے آخری لمحے تک انسانیت کی عمومی فلاح ونجات کی خاطر معبوث کئے گئے ہیں تب تک وہ امت محمدی کے نفسیاتی گنبد میں خود کو مقید رکھنے پر مجبور پائیں گے۔

امت مسلمہ بنام امت محمدیہ

امت مسلمہ ایک قرآنی اصطلاح ہے، جس کی تشریح وتعبیر اس دعائے براہیمی سے ہوتی ہے ﴿ربنا واجعلنا مسلمین لك ومن ذريتناامة مسلمةلك و أرنا مناسكنا و تب علينا انك انت التواب الرحيم﴾ (البقرة:١٢٨) اس دعا کی

مزید تفسیر کرتے ہوئے اگلی آیتوں میں مزید ارشاد ہے کہ جو دین براہیمی سے بے رغبتی کرے گا وہ دراصل اپنے نفس کے دھوکے میں مبتلا ہے۔ وہی ابراہیم جس کی اطاعت پر خود قرآن نے گواہی دی کہ جب اس سے کہا گیا کہ اطاعت گزار بن تو بول اٹھا ﴿اسلمت لرب العالمین﴾۔ بات یہیں ختم نہیں ہوگئی بلکہ اطاعت گزاری کی یہ روایت انہوں نے آگے بڑھائی۔ ابراہیم اور یعقوب نے اپنی اولاد کو وصیت کی ﴿یبنیّ ان اللہ اصطفی لکم الدین فلاتموتن الاوانتم مسلمون﴾ (البقرۃ:۱۳۲) کہ تمہیں موت نہ آئے مگر اس حالت میں کہ تم اطاعت گزاروں میں سے ہو۔ حضرت یعقوب جب دنیا سے رخصت ہو رہے تھے تو ان کے دل و دماغ پر بھی یہی فکر سوار تھی کہ میرے بعد ایسا نہ ہو کہ میرے بچوں کی اطاعت گزاری میں کوئی کمی واقع ہو جائے لہٰذا دنیا سے جاتے ہوئے انہوں نے اپنی اولاد سے اس بارے میں اطمینان حاصل کرنا مناسب جانا۔ بچوں کا یہ جواب ﴿نعبد الٰھك واله ابائك ابراهيم واسمعيل واسحق الها واحدا ونحن له مسلمون﴾ (البقرۃ:۱۳۳) اس دعائے براہیمی کا تسلسل ہے جس میں ابراہیم نے اپنی ذرّیات میں سے امت مسلمہ اٹھانے کی التجا کی تھی۔

قرآنی بیان کے مطابق امت مسلمہ دراصل خانوادۂ نبوت اور ان کے سچے متبعین پر مشتمل ایک ایسا گروہ ہے جس نے تاریخ کے ہر لمحے میں اور دنیا کے ہر خطے میں غیر مشروط اطاعت گزاری کی ریت کو برقرار رکھا ہے۔ اطاعت گزاروں کا یہ گروہ زمان و مکان، نسلی، لسانی اور جغرافیائی سرحدوں سے بے نیاز ہے۔ جس نے سچی اطاعت اختیار کی اللہ نے اسے اپنے مقربین میں شامل کر لیا۔ اطاعت گزاروں کے اس قافلے میں شامل ہونے اور قرب الٰہی کی بشارت کا مستحق قرار پانے کیلئے کسی کا عورت یا مرد ہونا بھی اس راہ کی رکاوٹ نہ بن سکا، ﴿یامریم ان اللہ اصطفٰك وطهرك واصطفك على نسآء العلمين﴾ (آل عمران:۴۲) یا حضرت آسیہ کو آنے والی نسلوں کیلئے بطور نمونہ پیش کرنا اسی خیال کی تصدیق ہے کہ خدا کے نزدیک اطاعت گزاروں کے قافلے میں شمولیت کے لئے عمل کی ہی اہمیت ہے۔ دوسری تمام نسبتیں یا حوالے کچھ معنی نہیں رکھتے لہٰذا جو لوگ ﴿کونوا هوداً او نصاریٰ﴾ پر اصرار کرتے ہیں یا جو امت محمد یہ سے نسبت کو نجات کے لئے کافی سمجھ بیٹھے ہیں ان کے لئے یہ تنبیہ و تحذیر ہے ﴿قل بل ملة ابراهيم حنيفا﴾ کہ وہ بلا پس و پیش ابراہیمی طریقے کو اختیار کر لیں۔ امت مسلمہ سے الگ کسی نبی کو فرقہ بندی کی عینک سے دیکھنا یا اس پر یہودی، نصرانی یا محمدی شناخت کے علمبردار ہونے کا الزام عائد کرنا، ایک ایسی بے اصل بات ہے جس کی تنبیہ کرتے ہوئے قرآن انبیائے سابقین کے متبعین سے کہتا ہے ﴿ء انتم اعلم أم الله﴾ تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ۔ انبیاء پر اس طرح کی گروہ بندی کا الزام عائد کرنا دراصل بہت بڑا ظلم ہے حقیقت سے جان بوجھ کر چشم پوشی ہے۔ ﴿ومن اظلم ممن کتم شهادة عنده من الله وما الله بغافل عما تعملون﴾ (البقرۃ:۱۴۰)۔

یہ ہے امت مسلمہ کا وہ تصور جو قرآن کے صفحات سے برآمد ہوتا ہے۔ ابراہیم و اسمٰعیل، اسحٰق و یعقوب اور تمام انبیائے

سابقین اوران کے سچے متبعین کی ایک جگمگاتی کہکشاں۔جس طرح ﴿محمد رسول الله والذين معه﴾ (الفتح:٢٩) آنے والی تاریخ میں سیادت پرفائز کئے گئے ہیں اسی طرح ﴿ابراهيم و اسماعيل، اسحاق و يعقوب والاسباط﴾ (النساء:١٦٣) پر مشتمل راہ یاب قدسی نفوس کے اس وسیع مجموعے کا نام امت مسلمہ ہے۔جولوگ پھر بھی اس بات پراصرار کریں کہ امت مسلمہ سے مراد صرف امت محمد یہ یااس سے نسلی تعلق رکھنے والے لوگ ہیں کیاوہ اس بات کی جسارت کرسکتے ہیں کہ براہیمی سلسلے کے دوسرے انبیاء کے متبعین یا آسیہ ومریم جیسی سپردہ نفوس کوامت مسلمہ کے اس وسیع دائرے سے باہر کردیں۔

صرف اطاعت گزاروں کے لئے اہل ایمان یااہل اسلام کے مقابلے میں ایک دوسرا گروہ اہل کفر ہے۔یہ وہ لوگ ہیں جن کے ہاتھوں سے توحید کا دامن جاتا رہا،گویا حبل اللہ سے ان کا تعلق ٹوٹ گیا۔یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی پراگندگی فکر ونظر کی وجہ سے اب کسی عمل صالح کے لائق نہیں رہے۔دائرہ توحید سے ایک بار باہر آجانا فسادِفکر ونظر کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم کردیتا ہے۔انبیاء کی وارث قومیں بھی اگرشرک کے راستے پرچل نکلیں توان کا شماراطاعت گزاروں میں نہیں ہوسکتا۔﴿لقد كفر الذين قالوا ان الله هو المسيح ابن مريم﴾(المائدة:١٧) یا ﴿لقد كفر الذين قالوا ان الله ثالث ثلثة﴾ (المائدة:٧٣) جیسی آیتیں اس بات پردال ہیں کہ خودکواہل ایمان کہلانے والے لوگ بھی اگرتوحید سے دست کش ہوجائیں توان کے اس صریح کفرکوخوشنما اصطلاحات یافقہی معاریض میں نہیں چھپایا جاسکتا اور نہ ہی ان کا یہ کہنا ان کی نجات کی ضمانت بن سکتا ہے کہ ﴿نحن ابناء الله واحبآؤه﴾ (المائدة:١٨)۔اس کے برعکس جن لوگوں نے توحید کا دامن تھام لیااورعمل صالح میں لگے رہےتوان کیلئے کسی رنج و غم کی ضرورت نہیں۔

سورہ ابنیاء میں انبیائے سابقین کے تذکرے اوران کی اطاعت گزاری کے بیان کے بعدصریح الفاظ میں یہ بات کہی گئی ہے کہ ﴿ان هذه امتكم امة واحدة﴾ (المؤمنون:٥٢)اطاعت گزاروں کا یہ طویل سلسلہ جس میں ابراہیم سےلیکرلوط وسلیمان،ایوب واسمٰعیل،ادریس وذوالکفل،ذوالنون وزکریا،یحیٰ اورمریم جیسے پاکیزہ نفوس شامل ہیں،دراصل یہ ایک ہی امت ہے۔یہ اور بات ہے کہ لوگوں نے آپس میں گروہ بندی کرلی ﴿فتقطّعوا امرهم بينهم﴾ (المؤمنون:٥٣) البتہ ان سبھوں کو ہماری ہی طرف لوٹنا ہے سوان میں سے جوکوئی نیک عمل کرے گا اوروہ اہل ایمان میں سے ہوگا،تواس صریح وضاحت کے بعداس بات کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے کہ اہل توحید پرمشتمل اس ایک امت سے انبیائے سابقین کے سچے متبعین کوخارج کردیا جائے ﴿كان النا س امة واحدة﴾ (البقرة:٢١٣)،﴿ان هذه امتكم امة واحدة﴾ کے تناظر میں ﴿ان ابراهيم كا ن امة قانتا﴾ (النحل:١٢٠) کے قرآنی بیان کوملاحظہ کیجئے۔وہی ابراہیم جواہل توحید کے قافلے میں ایک خاص فضیلت کے حامل ہیں جن کی غیرمشروط اور بےمثال اطاعت گزاری پرخودقرآن گواہ ہے۔اہل ایمان سے مطالبہ ہے کہ وہ اپنے اندرابراہیم جیسے ایمان

کی شان پیدا کریں۔ جو تمام جھوٹی شناختوں سے ماوراءرب کائنات کی عبودیت کا سچا رنگ لئے ہوئے ہے۔ دین ابراہیمی کے حاملین اورانبیاء سابقین کے تمام متبعین اسی راستے پر گامزن ہیں جس کی دعوت محمد رسول اللہ دے رہے ہیں۔ جن کے تذکرے سے توراۃ وانجیل کے صفحات پُر ہیں۔ ﴿الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونه مکتوباً عندهم فی التوراة والانجیل﴾ (الاعراف:۱۵۷)۔ پھر بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ اطاعت گزاروں کے اس قافلے میں مختلف چھوٹی چھوٹی امتیں پیدا ہو جائیں، خدا کے یہ برگزیدہ بندے جھوٹی گروہی شناخت میں مبتلا ہو جائیں کہ ایسا کرنا شرک کا دروازہ کو کھولنا ہے۔

امت مسلمہ کا یہی وہ ہمہ گیر تصور ہے جس نے مسلمانوں کے دلوں میں انبیائے سابقین کی باقیات کے لئے ہمیشہ خیر سگالی کے جذبات کو برقرار رکھا ہے۔ حتیٰ کہ ان ایّام میں بھی جب اصحابِ رسول کو اہل کتاب کے بعض گروہوں کی سخت مخالفت کا سامنا تھا، ان جنگی حالات میں جب نزول قرآن کے وقت اہل یہود کے بعض گروہ مسلسل ریشہ دوانیوں میں مبتلا تھے، قرآن نے اہل کتاب کے ان سعید نفوس کی ستائش سے اجتناب نہیں کیا جو خود اپنے ہم قوموں کے برعکس خدا ترسی کی راہ پر گامزن رہے ﴿لیسوا سواءً من اهل الکتٰب امة قائمة یتلون آیات الله﴾ (آل عمران:۱۱۳) یا ﴿ومن قوم موسیٰ امة یهدون بالحق﴾ (المائدۃ:۱۵۹) جیسی آیات اسی بات کو ذہن نشین کراتی ہیں کہ انسانوں کو محض کسی قومی شناخت کی بنیاد پر اہل کفر یا اہل ایمان کی گروہوں میں نہیں رکھا جا سکتا۔ جو خدا ﴿ان اکرمکم عندالله اتقٰکم﴾ کی بشارت دیتا ہو اور جس کا وعدہ ہو کہ ﴿لا تزروازرة وزراخــــریٰ﴾ وہ بھلا یہ کیسے پسند کر سکتا ہے کہ کسی شخص کی نسلی یا گروہی شناخت اس کے عمل صالح کو ساقط الاعتبار قرار دینے کا سبب بن جائے۔ اہل ایمان خواہ وہ کسی بھی تہذیب میں پائے جاتے ہوں ان کے لئے تو قرآن میں واضح بشارت موجود ہے ﴿ان الذین اٰمنو والذین هادوا والنصٰریٰ والصابئین من اٰمن بالله والیوم الآخر وعمل صالحا فلهم اجرهم عند ربهم ولا خوف علیهم ولاهم یحزنون﴾ (البقرۃ:۶۲)۔

قرآن کی یہ آیت جس میں فلاح وکامرانی کی بشارت کا دائرہ اممِ سابقہ کے خدا ترسوں تک وسیع کر دیا گیا ہے، بعض اصحابِ علم ودانش کے لئے سخت ذہنی خلجان کا باعث بنتی رہی ہے۔ ہمارے خیال میں اس خلجان کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے درمیان محمد رسول اللہ کی دعوت کو تمام انبیائے سابقین کے ارتکاز کے طور پر دیکھنے کا رواج کم ہی رہا ہے۔ حالانکہ قرآن باسالیب مختلف اس مجموعی تاثر کو بار بار ذہن نشین کراتا ہے کہ محمدؐ دینِ براہیمی کے داعی ہیں جنہیں امت مسلمہ کے احیاء اور تاریخ کے آخری لمحے تک اس کی قیادت پر مامور کیا گیا ہے۔ دوسری بات یہ سمجھ لینے کی ہے کہ اسلام جو تمام انبیاء کے ذریعے بلند کیا گیا کلمہ حق ہے ،اس کا محور ومرکز خدائے واحد کی پرستش ہے یہ ایک God-centered دین ہے، جہاں انبیاء علیہ السلام کی جگمگاتی کہکشاں میں کسی نبی کو کسی نبی پر فوقیت نہیں دی جاتی۔ خدا کے سچے پرستار سبھوں پر بیک وقت ایمان لاتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اسلام کو

محمد الاصل Mohammad-centered دین کی حیثیت سے دیکھنے کے خواہش مند ہیں تو دراصل ان کے ذہنوں پر St. Augustine جیسے عیسائی راہبوں کے عقائد کا سایہ ہے جنہوں نے اپنی تبلیغی اور فکری کاوشوں سے حضرت مسیح کو نجات کے لئے بنیادی پتھر باور کرا رکھا ہے اور اس طرح عیسائی تصور کائنات میں نجات صرف فرقہ عیسوی کیلئے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کے برعکس قرآن مجید نجات جیسے مسئلہ کو سرے سے انسانی بحث وتمحیص کے دائرے سے باہر قرار دیتا ہے۔ روزِ آخر کون جنت میں جائے گا اور کسے واصل جہنم کیا جائیگا، یہ وہ حساس امور ہیں جن پر کوئی قولِ فیصل انسانوں کے بس کی بات نہیں۔ اہل کتاب کو تو چھوڑیے، انہیں تو قرآن دینِ محمدی کے فطری حلیف کے طور پر پیش کرتا ہے حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جن کے دامن شرک سے آلودہ ہو گئے ان کیلئے بھی خدا کا ارشاد ہے کہ سزا و جزا کا یہ فیصلہ وہ بذاتِ خود روزِ حشر انجام دے گا۔ اس بارے میں کوئی گفتگو انسانوں کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے: ﴿ان الله يفصل بينهم يو م القيامة﴾ (الحج: ١٧)۔

جس طرح مختلف شعوب وقبائل سے انسانوں کا تعلق محض تعارف کیلئے ہے ﴿وجعلنا كم شعوبًا وقبائل لتعارفوا﴾ (الحجرات: ١٣) اسی طرح یہ بھی خدائی اسکیم کا ایک حصہ ہے کہ اس کے سچے بندے مختلف دینی شناخت کے ساتھ جانے جائیں: ﴿ولو شاء الله لجعلهم امة واحدة﴾ (الشوریٰ: ٨) اگر خدا ترسوں کے مختلف گروہ انبیائے سابقین کی باقیات وذرّیات، خود کو راہ یابی کے مختلف سلسلوں سے وابستہ پاتے ہوں تو انہیں جان لینا چاہیے کہ توراۃ وانجیل بھی اسی خدا کی کتاب ہے اور وہاں بھی ہدایت اور روشنی موجود ہے۔ انبیائی پیغام سے اپنا تعلق بتانے والوں کو یہ زیب نہیں دیتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی نجات کا فیصلہ کرنے کیلئے بیٹھ جائیں یا اس خیال کی وکالت کرنے لگیں کہ لوگو! یہودی اور عیسائی ہو جاؤ نجات اسی میں ہے اور جو اس شناخت سے باہر رہ گیا اس کیلئے نجات کی کوئی سبیل نہیں۔ اس کے برعکس قرآن کا مطالبہ ہے کہ انبیائی ہدایت کے امین، مختلف تہذیبوں میں پائی جانے والی سعید روحیں، غیر ضروری مباحث میں اپنی قوتوں کو ضائع کرنے کے بجائے اس بات کی کوشش کریں کہ وہ ایک دوسرے پر نیکی کے کاموں میں سبقت لے جائیں۔ خدا کے لئے یہ کچھ مشکل نہ تھا کہ وہ تمام انسانوں کو یا اہل حق کے تمام ہی گروہوں کو ایک امت بنا دیتا لیکن اس کی تو اسکیم یہ ہے کہ جس امت کو جو دیا گیا ہے اسی کی بنیاد پر اسے آزمائے: ﴿ولكن ليبلوكم فى ما آتاكم فاستبقوا الخيرٰت﴾ (المائدة: ٤٨)۔

مسلمانوں کی پہلی نسل جو انبیائی سلسلے میں محمد رسول اللہ کے مقام عظمت سے واقف تھی اس نے ان امور کو کبھی معرض بحث نہیں بنایا کہ روز محشر انبیائے سابقین کے متبعین کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔ اس کے برعکس اہل کتاب کے حوالے سے وہ اس دعوت کے امین رہے کہ اے اہل کتاب آؤ ان بنیادی باتوں کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترکہ ہیں: ﴿قل يا اهل الكتٰب تعالوا الىٰ كلمة سواء بيننا وبينكم الا نعبد الا الله ولا نشرك به شيئا و لا يتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون الله فان تولوا فقولوا اشهدوا بانامسلمون﴾ (آل عمران: ٦٤)۔

جو لوگ انسانیت کی سیادت پر فائز کئے گئے ہوں ان کے مقام بلند کا یہ فطری تقاضہ تھا کہ وہ اہل حق کے تمام ہی گروہ کو وسعتِ قلبی کے ساتھ قبول کریں۔ تمام اہل حق پر نئی نبوی تحریک میں شرکت کا دروازہ کھلا رکھیں تبھی یہ ممکن ہے کہ انبیائے سابقین کے سچے اور جھوٹے دعویدار الگ ہوسکیں۔ جو لوگ واقعی خداشناس ہوں گے وہ" فاستبقو الخیرا ت " کی دعوت پر لبیک کہیں گے۔ ربانی تحریک کی راہ میں ایسے خداشناس لوگ مزاحم نہیں ہوسکتے۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے یہودی یا نصرانی نسبتوں کو ہی وجہ نجات سمجھ رکھا ہے تو ان کیلئے صاف صاف بتا دیا گیا کہ ﴿قل یا ھل الکتٰب لستم علی شئی حتیٰ تقیموا التوراۃ والانجیل وما انزل الیکم من ربکم﴾ (المائدۃ:٦٨) یہ نام نہاد اہل کتاب جو دین کے نام پر گروہی عصبیت جیسی لعنت میں مبتلا ہیں اور جن کا فرقہ ہی ان کے لئے الہٰ کی حیثیت اختیار کر گیا ہے تو شرک کے مارے ان نام ونہاد وارثینِ انبیاء سے تو دور رہنا ہی بہتر ہے۔ ایسا نہ ہو کہ گروہی عصبیت کا یہ زہر اور ان کی تنگ رجعت پسندانہ ذہنیت تمہیں بھی اپنی لپیٹ میں لے لے۔ سو اہل ایمان کو تلقین ہے کہ ﴿یایھاالذین اٰمنو لا تتخذ وا الیھود والنصٰریٰ اولیاء بعضھم اولیاء بعض﴾ (المائدۃ:٥١)۔ البتہ کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ اس قسم کے قرآنی بیانات اہل کتاب کی طرف کسی عمومی بیان کے مظہر ہیں کہ قرآن میں جابجا باقیات انبیائے سابقین کو نہ صرف یہ کہ شرکتِ عمل کی دعوت دی گئی ہے بلکہ مسلمانوں کے ذہنوں میں اٹھنے والے ممکنہ شبہات کا بھی ازالہ کردیا گیا ہے ﴿لیسوا سواءً من اھل الکتٰب امۃ قائمۃ یتلون اٰیت اللہ اٰناء الیل وھم یسجدون﴾ (آل عمران:١١٣)۔

یہ بات کہ اہل کتاب مسلمانوں کے فطری حلیف ہیں ابتدائی عہد میں ایک امر مسلمہ کی حیثیت سے تسلیم کی جاتی تھی۔ قرآن نے اہل کتاب سے موالات کی راہ کھلی رکھی تھی۔ ان کا کھانا پینا مسلمانوں کے لئے حلال قرار دیا گیا تھا حتیٰ کہ معاشرتی تعلقات کے قیام کیلئے بھی صریح قرآنی ہدایات موجود تھیں۔ عفت مآبی کی شرط کے ساتھ اہل کتاب کی عورتیں بھی عفت مآب مسلمان عورتوں کی طرح حلال قرار دی گئی تھیں ﴿الیوم احل لکم الطیبٰت وطعام الذین اوتوا الکتٰب حلّ لکم وطعامکم حلّ لھم والمحصنٰت من المومنٰت والمحصنٰت من الذین اوتوالکتٰب من قبلکم﴾ (المائدۃ:٥)۔ ایک ایسے ماحول میں جہاں تقویٰ اور پاکیزگی کی بنیاد پر انسانی زندگی کی تنظیم نو کی جارہی ہو، جہاں گروہی نسبتیں، نسلی تفاخر اور جھوٹی دینی شناخت کالعدم قرار دی جارہی ہو، یہودی، عیسائی یا قومی مسلمان بنانے کے بجائے ربّانی بنانے کا غلغلہ بلند ہو، کسی کے حاشیۂ خیال میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ آنے والے دنوں میں متبعین محمد کا ذہنی افق اس قدر تنگ ہوجائے گا کہ ان کی نسلیں اپنے لئے ایک قومی شناخت کو گوارہ کرلیں گی اور مسلم ہونا ان کے درمیان رویّے کے بجائے شناخت بن کر رہ جائے گا۔ بدقسمتی سے بعض سیاسی حوادث اور تاریخی عوامل نے آنے والے دنوں میں ایک ایسے ہی تنگ نظر متعصب قومی شناخت کی راہ ہموار

کردی جس کے لئے جلد ہی روایات و تاریخ کے ماخذ اور فضائل سے متعلق تراشیدہ قصوں نے ایک مستقل نظامِ فکر مرتب کر ڈالا۔ امت مسلمہ جو خود کو تاریخ کے آخری لمحے تک قیادت کے منصب پر فائز سمجھتی تھی اور جوامم سابقہ کی باقیات کو اسی قائدانہ وسعتِ نظری سے دیکھتی تھی رفتہ رفتہ انہیں رقیب تصور کرنے لگی۔ امت محمدیہ کی نفسیات کے جنم لینے سے نہ صرف یہ کہ قائدانہ نفسیات اور وسعتِ نظری کا خاتمہ ہو گیا بلکہ مسلمانوں کے ذہنوں پر یہ بات نقش ہونے لگی کہ وہ بھی دوسری امتوں کی طرح ایک امت ہیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح قومی مسلمانوں نے بھی اپنی امت کو دوسری امت سے افضل باور کرانے کی خاطر خوش گمانیوں پر مشتمل روایات کی بھر مار کر ڈالی۔ حتیٰ کہ ایسی روایتیں بھی وجود میں آگئیں جن میں یہ بتایا گیا تھا کہ روزِ قیامت کس طرح دوسری قوموں کے مقابلے میں مسلمان بآسانی داخل جنت کئے جائیں گے۔ ایسا اس لئے کہ بعض روایتیں محمد رسول اللہ کو شفاعت کے اس منصب پر فائز کرتی تھیں جس کا یارا ابراہیم اور دوسرے انبیاء کو نہ تھا۔ بعض روایتیں یہ بتاتی ہیں کہ اس دن لواء الحمد صرف محمدؐ کے ہاتھ میں ہوگا جو اپنی امت کی خاطر خصوصی شفاعت کے لئے سارا زور صرف کر دیں گے۔ جیسا کہ بعض روایتیں بتاتی ہیں ایسا محسوس ہوگا کہ گویا عام مسلمانوں کے ساتھ بھی انبیائے بنی اسرائیل جیسا معاملہ کیا جا رہا ہے۔

امت مسلمہ کے منصبِ عظیم سے بہت نیچے لا کر امت محمدی کی قومی عصبیت کو فروغ دینے کے لئے جو روایتیں وضع کی گئیں اس میں اس بات کا بھی خیال نہیں رکھا گیا کہ اس کی زد رسول اللہ کے منصبِ عظیم پر کس طرح پڑتی ہے۔ جو نبی تمام انسانیت کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا گیا اور جس کے رحمۃ للعالمین ہونے پر خود قرآن شاہد ہے اور جس کے بغیر آنے والی ساری انسانی تاریخ بے معنیٰ ہے، اس نبی کے بارے میں مسلمانوں میں یہ تصور عام ہوا کہ وہ دنیا سے بھی امتی امتی کرتا رخصت ہوا اور روزِ حشر بھی اپنی امت کو باریاب کرانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دے گا۔ جب رسول ﷺ کے بارے میں یہ خیال عام ہو کہ وہ عام انسانیت کے بجائے صرف اپنی امت کی فلاح و بہبودی کو مطلوب و مقصود جانتا ہو تو بھلا اس کے متبعین کے لئے یہ کیسے ممکن ہوتا کہ وہ اپنے تراشیدہ خولِ مسلمانی سے باہر آ کر عام انسانیت کی نجات کی فکر اور اسے ہانکے پکارے فلاح و کامرانی کی طرف بلا سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیادت پر فائز امت اپنی پیدا کردہ امانیات اور خوش گمانیوں کے زیر اثر خود ساختہ معزولی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئی۔

متبعین محمدؐ کی ابتدائی نسلیں جب تک ربانی شناخت سے متصف رہیں ان کے فکر ونظر پر یہ خیال غالب رہا کہ وہ دینِ براہیمی کی نقیب اور تمام انبیائے سابقہ کی وراثتوں کی امین ہیں۔ان کی پیش قدمی مانند سیل رواں جاری رہی۔گم گشتہ انسانیت کے قافلے، انبیائے سابقین کے باقیات جوق در جوق آخری نبی کی ربانی تحریک میں شامل ہوتے رہے۔عام انسانوں کو ایسا لگتا تھا جیسے اس ربانی تحریک کے دروازے ان پر وا ہیں۔

پہلی نسل کے مسلمان حریتِ فکر کی لذت سے آشنا تھے۔ عام مسلمان اپنے قائدین اور اہل علم پر تنقیدی نگاہ ڈالنا اپنا حق سمجھتے۔ حتی کہ عین خطبہ کے دوران ایک اعرابی عورت خلیفۂ وقت کو ٹوک دینا اپنا حق سمجھتی۔ مسلمانوں میں حریتِ فکر کی روایت جب تک باقی رہی ان کی نگاہیں اصحاب علم وفن سے ماوراء وحی کے اوراق میں ہدایت کی طالب رہیں۔ البتہ جب سے اصحاب علم وفن نے اپنے آپ کو عام انسانوں سے الگ ایک مقدس مخلوق کی حیثیت سے پیش کرنے کی طرح ڈالی اور ان کے ناموں کے آگے پیچھے تقدس مآب القاب وآداب کی طویل قطار وجود میں آنے لگی مسلم ذہن پر تقلید کی دھند دبیز ہوتی گئی۔

اس شرک سے نجات کا بھی کوئی راستہ ہے؟

مسلمان مجموعی طور پر شرک کے گردابِ شر میں گرفتار ہیں۔ سیادتِ عالم کے منصبِ جلیل سے ان کی معزولی کا بنیادی سبب یہی ہے کہ توحید خالص کا دامن ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا ہے۔ شرک کے نتیجے میں برگزیدہ قوموں پر جو عذاب آتا ہے اور جس طرح ان کی ہوا اُکھڑتی ہے اس کا مشاہدہ آج مسلمانوں کے حوالے سے چہار دانگِ عالم میں کیا جا سکتا ہے۔

گزشتہ چند برسوں میں مسلمانوں کے مضطرب ذہن مختلف لب و لہجے میں اپنے آپ سے پوچھتے رہے ہیں کہ کیا خدا اب ان کا ساتھ چھوڑ چکا ہے؟ آخر کیا وجہ ہے کہ ساری دنیا میں مسلمانوں کا خون ارزاں اور ان کی غیرت سستی ہوگئی ہے؟ حالیہ برسوں میں افغانستان اور عراق میں جو کچھ ہوتا رہا ہے اس نے اس سوال کی دھار اور بھی تیز کر دی ہے کہ خدا نے آخری پیغام کے حاملین پر سے اپنی شفقت و نصرت کا ہاتھ کیوں اٹھا لیا ہے۔ اس سوال کا کوئی تشفی بخش جواب دیا جانا ابھی باقی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اہل یہود کی طرح ہم مسلمان بھی اپنی معزولی کے باوجود خود کو خیر امت کے منصبِ جلیل پر فائز سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں، حالانکہ آج جو لوگ دنیا کے سیاہ و سفید کا فیصلہ کر رہے ہیں وہ بد قسمتی سے ہم نہیں ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ ہماری تمام تر گمرہی چونکہ مصنوعی مذہبیت کے جلو میں آئی ہے اس لیے حقیقتِ واقعہ کا صحیح اندازہ کرنا عام لوگوں کے لیے تو کیا خواص اور علماء کے لیے بھی دشوار ہو رہا ہے۔ کہنے کو تو پوری امت دین پر عمل پیرا ہے' یا کم از کم دین کے حوالے سے اس کے اندرون میں مختلف مذہبی تحریکیں جاری و ساری ہیں، لیکن اگر حقیقت شناس نگاہوں سے دیکھا جائے تو یہ سب ایک سنگین دھوکے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

توحید انسانوں کو جوڑتا اور شرک انھیں ٹکڑوں میں بانٹ دیتا ہے۔ توحیدی طرزِ فکر انسانوں کو ایک خدا اور اس کے ربانی نظام میں پرونا چاہتی ہے، جبکہ شرک پسند ذہن انسانوں کو خانوں میں بانٹنے اور ان کی گروہ بندیوں کے لیے مختلف حیلے تلاش کر لیتا ہے۔ پچھلے انبیاء کی اُمتیں جن کی طرف بھی توحید خالص کی یہی دعوت بھیجی گئی تھی اپنی من مانی تشریح و تعبیر کے نتیجے میں گروہوں میں بٹ چکی تھیں۔ قرآن کا بیان ہے کہ رسول اللہ کی آمد سے ان گروہ بندیوں اور اختلاف کا خاتمہ ہوا اور توحید کی تجدید نے ان کے اندر پھر سے ﴿فألف بين قلوبكم﴾ کا ماحول پیدا کر دیا۔

شرک کا یہ قالب کہ وہ مذہب کے حوالے سے اہلِ مذہب کے دل و دماغ پر اپنے ڈیرے جمائے، انسانی تاریخ میں نیا عمل نہیں ہے۔ درختوں کی پرستش اور سورج، چاند کی پوجا ایک ایسا کھلا شرک ہے جسے عام نگاہیں بھی دیکھ لیتیں ہیں۔ البتہ دین کے نام پر فرقہ بندی یا کسی خاص تعبیر دین کو دین قرار دینا اور اس کی پرستش میں مبتلا ہو جانا ایک ایسا عمل ہے جس کی سنگینی کا اندازہ ہر خاص و عام کو نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کی مجموعی صورتِ حال پر نظر ڈالئے آخر کیا وجہ ہے کہ مسلمان باہم ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔ کہیں یہ جنگ زبانی ہے، کہیں اس میں الفاظ اور فتاویٰ کے گولے بارود استعمال ہو رہے ہیں اور کہیں عین حالتِ نماز میں مسجدوں کے اندر ایک مسلک کا مسلمان دوسرے مسلک کے مسلمان کو بلا تکلف گولیوں کا نشانہ بنانے سے نہیں چوکتا۔ دین کے نام پر دنیا بھر میں جو مدارس قائم ہیں ان پر کسی خاص طرزِ فکر یا مسلک کا رنگ غالب ہے۔ قال اللہ وقال الرسول کے جلو میں ان کی اصل کوشش اس بات کی ہے کہ وہ اپنے فرقے کو حق اور دوسروں کو باطل ثابت کریں۔ یہ سلسلہ صرف ہندوستان تک ہی موقوف نہیں پوری مسلم دنیا بلکہ یورپ اور امریکہ میں جو مسلمانوں کے ادارے قائم ہوئے ہیں سب کے سب اسی گروہ بندی میں مبتلا ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ الٰہ واحد کی بندگی کے بجائے ایک طرح کی cult-worship میں مبتلا ہیں۔ ان کے لئے ان کے فرقے یا گروہ اور مسلک نے ہی الٰہ کا مقام حاصل کر رکھا ہے اور وہ اپنے اکابرین کی تشریح و تعبیر کو پیغمبرانہ حد تک سچ سمجھنے لگے ہیں۔ اسی صورتِ حال کا بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے ﴿ا ن الـذیـن فـرقـوا دینهم و کانوا شیعاً لست منهم فی شیء﴾ یعنی جن لوگوں نے دین میں فرقہ بندی کی اور گروہوں میں بٹ گئے ان کا (اے محمدؐ) آپ سے کوئی تعلق نہیں۔ (الانعام:۱۵۹)

ہماری موجودہ دین داری جس پر بدقسمتی سے گروہ بندی اور مسالک کا رنگ نمایاں ہے، ہماری مساجد اور مدارس جس طرح مسالک اور فرقوں میں بٹ گئے ہیں یا جس طرح ہم دین کی فقہی تعبیر کے نام پر آج خود کو حنفی اور شافعی کے خانوں میں پاتے ہیں اس کے بعد اس حقیقت کا ادراک کرنے میں کچھ زیادہ دشواری نہیں ہونی چاہیے کہ ﴿حبـل الله﴾ ہمارے ہاتھوں سے پھسل چکی ہے۔ اس بھری پری کائنات میں آج کون ہے جو لوگوں کو ایک خدا کی طرف بلا رہا ہو۔ ہر مسجد کے منبر سے اور مدرسہ کے مسندِ ارشاد سے بس اسی بات کی دعوت دی جارہی ہے کہ آؤ ہمارے فرقے میں شامل ہو جاؤ، دین خالص کے علمبردار تو ہم ہی ہیں۔ کہنے والوں کو اس بات کا شعور نہیں کہ دین کے نام پر وہ کس بدترین قسم کی فرقہ پرستی میں مبتلا ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ قرآن مجید کی موجودگی کے باوجود مسلمانوں کے تمام ہی گروہ یا فکری حلقے اپنی دینی مشین کو متحرک رکھنے کے لیے اپنے اکابرین کی کتابوں پر انحصار لازم خیال کرتے ہیں۔ قرآن مجید کی موجودگی کے باوجود بھی کیا اس بات کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ کسی فقیہ و مفسر یا امام یا اہلِ دل کی کتابوں کو فہمِ دین میں سند کا مرتبہ حاصل ہو۔ ہمیں تو واضح الفاظ میں یہ بتایا گیا ہے کہ ﴿لاتـکـونـوا کالذین تفرقوا واختـلفوا من بعد ما جآء هم البینٰت﴾ (آل عمران:۱۰۵) یعنی ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو بیّنات آجانے کے بعد بھی فرقہ بندی اور اختلاف کا شکار ہو گئے، ایسے لوگوں کے لیے بڑا عذاب ہے۔

آج اُمت مسلمہ جس دردناک عذاب میں گرفتار ہے وہ تفرقہ اور اختلاف کا لازمی نتیجہ ہے۔ الٰہی پیغام کی حامل قوموں نے جب بھی دین کی تعبیر کے نام پر گروہ بندی کو جائز قرار دیا وہ دین کے حوالے سے cult-worship میں مبتلا ہو گئیں۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ تمام انبیاء پر ایک ہی دین بھیجا گیا اور انھیں یہ تاکید کر دی گئی کہ ﴿أن أقيموا الدين و لا تتفرقوا فيه﴾ یعنی وہ اُسے قائم رکھیں اور اس میں پھوٹ نہ ڈالیں۔ رسول اللہ کو جن لوگوں کی طرف بھیجا گیا ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کے نام لیوا تھے۔ ان کے یہاں رسمی دین داری کی کمی نہ تھی۔ البتہ وہ دین ہی کے نام پر بدترین قسم کے تفرقے میں مبتلا تھے۔ ان سابق اہلِ ایمان کی ذہنی معراج یہ تھی کہ جس کسی کو جنت میں اپنی جگہ محفوظ کرانی ہو اُسے چاہیے کہ وہ ان جیسا بن جائے اور بس ﴿وقالوا كونوا هوداً أو نصارىٰ﴾ وہ کہتے تھے کہ یہودی اور عیسائی بن جاؤ۔ یہ حضرات جو خیر سے خود کو وقت کا مسلمان سمجھتے تھے باہم ایک دوسرے کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ اہلِ یہود کے پاس ہے ہی کیا اور یہودی کہتے تھے کہ عیسائیوں کے پاس کچھ نہیں۔ قرآن نے ان فرقہ بندیوں کو یکسر گمرہی قرار دیا۔ محمد رسول اللہ نے فرقہ پرستی کے عذاب میں مبتلا انبیاء سابقین کی قوموں کو یہ حیات افزاء آفاقی پیغام دیا کہ لوگو! عیسائی یا یہودی بننے سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ اصل بات تو یہ ہے کہ ربّانی بنو ﴿كونوا ربانيين﴾۔ اللہ کا رنگ اختیار کرو ﴿و من احسن من الله صبغه﴾۔

قرآن کی ابتدائی سورتیں مختلف اسلوب سے وقت کے مسلمانوں (یہود و نصاری) یعنی انبیاء سابقین کی اُمتوں کو فرقہ بندی کے عذاب سے نکلنے کی دعوت دیتی ہیں ﴿وما كان ابراهيم يهودياً ولا نصرانياً و لكن كان حنيفاً مسلماً﴾ (آل عمران:٦٧) رسول اللہ کی دعوتِ توحید وقت کے مسلمانوں کو یہ بتا رہی تھی کہ توحید خالص کے علمبردار فرقہ بندی میں مبتلا نہیں رہ سکتے۔ خواہ یہ فرقہ بندی انبیائی حوالے سے ہی کیوں نہ وجود میں آئی ہو خدا کو مطلوب عیسائی یا یہودی بنانا نہیں بلکہ ربانی بنانا ہے۔

جو کتاب کسی رسول کے نام پر بھی گروہ بندی کی اجازت نہ دیتی ہو وہ اس بات کی اجازت کیسے دے سکتی ہے کہ اس کے ماننے والے غیر نبیوں کے نام پر مختلف فرقے وجود میں لے آئیں۔ ﴿كونوا ربّانيين﴾ کی قرآنی دعوتِ انقلاب آج ہم سے پوچھتی ہے کہ آخر یہ کیسے ممکن ہوا کہ محمد رسول اللہ کے ماننے والوں نے اپنی تاریخ کے ایک مرحلے میں حنفی شافعی، شیعہ سنی، بریلوی دیوبندی اور سلفی جیسی جماعتی شناختوں کو قبول کر لیا۔ آخر یہ کیسے ممکن ہوا کہ کبھی توحید خالص کے علمبردار دین کے حوالے سے بدترین قسم کی فرقہ پرستی میں مبتلا ہو گئے اور انھیں رفتہ رفتہ یہ سب کچھ معمول کی زندگی لگنے لگی۔ cult-worship میں مبتلا مسلمانوں کے مختلف گروہوں کو، جس میں بدقسمتی سے آج جمہور اُمت گرفتار ہے، قرآن کی یہ صریح آیت کیوں نظر نہیں آتی کہ جن لوگوں نے دین میں فرقہ بندی کی، گروہوں میں بٹ گئے، ان کا کوئی تعلق اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں رہ گیا ہے۔ ﴿ا ن الذين فرقوا دينهم و كانوا شيعاً لست منهم فى شيىء﴾ (الأنعام:١٥٩)۔

شرک کا یہ قالب کہ وہ مذہب کے حوالے سے اہلِ مذہب کے دل و دماغ پر اپنے ڈیرے جمائے' انسانی تاریخ میں نیا عمل نہیں ہے۔ درختوں کی پرستش اور سورج، چاند کی پوجا ایک ایسا کھلا شرک ہے جسے عام نگاہیں بھی دیکھ لیتی ہیں۔ البتہ دین کے نام پر فرقہ بندی یا کسی خاص تعبیر دین کو دین قرار دینا اور اس کی پرستش میں مبتلا ہو جانا ایک ایسا عمل ہے جس کی سنگینی کا اندازہ ہر خاص و عام کو نہیں ہوتا۔

آج اگر قرآن مجید کی موجودگی کے باوجود مسلمانوں کو سرنگ کی دوسری طرف روشنی دکھائی نہیں دیتی تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ہمارے درمیان وحی کی عظمت کے مقابلے میں علماء وفقہاء کی عظمت کہیں زیادہ مستحکم ہوگئی ہے۔ ہم قرآن مجید کے راست مطالعے اور اس سے اپنا چراغِ فکر روشن کرنے کے بجائے یہ ضروری خیال کرتے ہیں کہ ہمارے اس خیال کی تائید علمائے قدیم کے اقوال سے ہوتی ہے یا نہیں۔

مسلم فکر میں انقلاب کی ضرورت

مسلمان اس وقت جس بحران عظیم سے دوچار ہیں اس کی شدّت کا اندازہ کچھ اس سوال سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہر خاص و عام کسی نہ کسی لب ولہجہ میں اس خلجان کا اظہار کررہا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ قرآن مجید کی موجودگی کے باوجود ہمیں من حیث الامّہ سرنگ کی دوسری طرف کوئی واضح روشنی دکھائی نہیں دیتی۔ جس امت پر سیادتِ عالم کا فریضہ عائد کیا گیا ہے وہ قرآن مجید کی موجودگی اور علماء ومفسرین کے سلسلۂ درس وارشاد کے باوجود سخت نظری بحران میں کیوں مبتلا ہے۔ Auschwitz میں اہل یہود پر جو گزری اس کے بعد ان کے یہاں بھی اس سوال نے شدت سے سر اٹھایا تھا کہ خدا اپنی برگزیدہ قوم کو آخر کس طرح بے یارومدد گار چھوڑ سکتا ہے۔ یہودی علماء اور دانشور اپنے آپ سے پوچھا کئے کہ اگر دنیا سے قوم یہود کا اسی طرح صفایا ہوگیا تو تاریخ کی معنویت کیا رہ جائے گی؟ اہل یہود جو عرصہ ہائے دراز سے تاریخ میں جینے کے خوگر ہیں وہ اب تک اس حقیقت کا ادراک کرنے میں ناکام رہے ہیں کہ دنیا کی سیادت سے ان کی معزولی عمل میں آگئی ہے۔ اہل یہود اور مسلمانوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ایک کی معزولی الٰہی فیصلہ ہے جبکہ امت مسلمہ کا زوال تاریخ کا ایک ایسا انحراف ہے جس کی درستگی کی ترکیب آخری وحی کی روشنی میں عین ممکن ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ صورتِ حال کا صحیح تجزیہ کرنے اور وحی ربانی کی روشنی میں اپنی گم کردہ راہوں کو منور کرنے کے بجائے مسلمان وحی کے بجائے تاریخی اسلام کے اسیر ہوگئے ہیں جس کی وجہ سے انہیں اپنے زوال اور تاریخ کے انحراف کا صحیح اندازہ لگانے میں سخت دشواری پیش آرہی ہے۔

دنیا اس وقت اپنی تاریخ کے بدترین بحران سے دوچار ہے۔ Development کے نام پر غیر منصوبہ بند طریقے سے مختلف ملکوں میں جو کچھ ہوتا رہا ہے اور جس طرح مختلف تنگ نظر مفاد پرست گروہوں نے دنیا کو اپنی مٹھّی میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے اس کے نتیجہ میں اس وقت عالمی سطح پر انسانیت ایک غیر یقینی مستقبل سے دوچار ہے۔ ماحولیات کی تباہی، دنیا کی دولتوں کا چند ہاتھوں میں ارتکاز، بین الاقوامی کمپنیوں کی اجارہ داری، ذرائع ابلاغ کے ذریعہ فکرونظر کی آزادی کا چھن جانا اور انسانوں کو وہی کچھ دیکھنے اور سننے پر مجبور کرنا جو دنیا کی چند بڑی قوتیں یا بااثر ٹولہ چاہتا ہے، یہ سب کچھ ایک ایسی صورت حال ہے جس سے نکلنے

کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی ۔خدا بیزار پالیسی ساز ذہن نے پوری دنیا کو ایک ایٹمی بھٹّی میں تبدیل کر دیا ہے۔انسانوں کی فکری اور مادی توانائی زندگی کے بجائے موت کی تیاری میں صرف ہو رہی ہے ۔ایسی صورت حال میں توقع تھی آخری وحی کے علمبردار انسانیت کے بے سمت قافلے کی رہنمائی کے لیے سامنے آئیں گے۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ خیرِ امت کے تمام تر دعووں کے باوجود امّت مسلمہ خود اپنے وجود کی لڑائی میں الجھ کر رہ گئی ہے ۔اس میں شبہ نہیں کہ دنیا کی موجودہ بے سمتی تمام ہی خدا ترس نفوس سے رہنمائی کا مطالبہ کر رہی ہے ۔البتہ اگر مسلمان بھی دوسری قوموں کی طرح اس چیلنج کو قبول کرنے کا یارا نہیں رکھتے تو پھر آخری وحی کے حاملین کی حیثیت سے ان کا وجہ ٔ امتیاز کیا رہ جاتا ہے؟

گذشتہ دنوں مذاہب کی عالمی پارلیامنٹ میں شرکت کی غرض سے مجھے اسپین جانے اور وہاں مونٹ سراٹ کی چوٹی پر ایک عیسائی خانقاہ میں قیام کا موقع ملا۔اسی خانقاہ میں چند سکھ رہنما اور منی پور کے ایک پنڈت جی بھی قیام فرما تھے۔ میں نے یہ دیکھا کہ صبح اندھیرے منھ اٹھ کر خاصی دیر تک محترم پنڈت جی کسی سفید رنگ سے بصد احتیاط اپنی پیشانی کو ناک تک مزّین کرتے رہے یہاں تک کہ ان کے چہرے بشرے سے مذہبی رہنما ہونا واضح ہو گیا۔ دوسری طرف ایک سکھ بزرگ ایک طویل کپڑے کو ٹھیک کرنے میں اپنے احباب کی مدد لے رہے تھے تاکہ وہ مذاہب کے عالمی اجتماع میں باندازِ سکھ اپنی نئی پگڑی کے ساتھ شرکت کر سکیں۔اس عالمی اجتماع میں طرح طرح کے مذہبی لباس اپنی جاہ وشکوہ کا اظہار کر رہے تھے۔عیسائی راہبوں کا مخصوص لباس ٬اہل یہود کی مخصوص ٹوپی٬ برہما کماریوں کی سفید ساڑیاں اور بعض مسلم علماء کا ملبوسِ ریگستانی۔کسی نے اپنے نام کے آگے ہزہولی نیس His Holiness لکھ رکھا تھا تو کسی کو Reverend یا فادر کے لاحقے پر اصرار تھا٬ کوئی ربائی تھا تو کوئی مولانا٬ اور کسی نے بہ صد احتیاط اپنے نام سے پہلے امام لکھنا مناسب سمجھا تھا۔

خدا شناسوں کے اس اجتماع میں لباس کی غیر معمولی تزئین اور احتیاط پر سخت حیرت بلکہ کوفت ہوئی۔ میں نے اپنے ہمسایہ پنڈت جی سے پوچھا اہل مذاہب کے اس عالمی اجتماع میں ہر ایک کو اپنے مخصوص لباس پر اتنا اصرار کیوں ہے؟ بہت کچھ بحث وتمحیص کے بعد وہ دل کی بات بلا تکلف زبان پر لے آئے۔ کہنے لگے دراصل لوگ رشد وہدایت کے لیے ہماری طرف دیکھتے ہیں۔ وہ ہمیں عام انسانوں سے الگ رول ماڈل کے طور پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ظاہر کی یہ تمام آرائش دراصل ان کے اسی مطالبے کے پیش نظر ہے۔ ورنہ حقیقی بندگی سے بھلا لباس کا کیا تعلق۔ رسوماتِ بیجا کے اس اہتمام میں صرف پنڈت جی کو ہی موردالزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔تقریباً تمام ہی مذاہب کے رہنماؤں نے عوام الناس سے اپنے آپ کو ممتاز کرنے کے لیے ایسے لباس کو اختیار کر رکھا ہے جس سے ان کا مذہبی یا خدا شناس ہونے کا فی الفور اور بہ نظر اول پتہ چل سکے۔ عام انسانوں کے لیے یہ ادراک کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس بھاری بھرکم لباسِ تقویٰ میں گوشت پوست کا کوئی عام انسان سانس لے رہا ہے جس کی فہم وبصیرت پر تنقیدی نگاہ بھی ڈالی جاسکتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جب رومی افسران حضرت مسیحؑ کی گرفتاری کے لئے آئے تھے تو ان کے لئے حواریوں کی مجلس میں حضرت مسیحؑ کی شناخت مشکل ہوگئی تھی۔ انہیں جوڈا کے بوسۂ تعظیم کا سہارا لینا پڑا تھا۔ حضرت مسیحؑ تو پھر بھی ایک برگزیدہ نبی تھے خود محمدؐ رسول اللہ کے متبعین کا یہ حال تھا کہ انہوں نے کبھی بھی اپنے لئے کسی مصنوعی اور ظاہری وجہٗ امتیاز کو گوارا نہیں کیا۔ مدینہ کی گلیوں میں باہر سے آنے والے غیر ملکی وفود خلیفۂ وقت حضرت عمرؓ کی بابت پوچھا کرتے اور انہیں یہ جان کر سخت حیرت ہوتی کہ ہٹو بچو سے دور معمولی سے لباس میں خلیفۂ وقت ان سے مخاطب ہے۔ پہلی نسل کے مسلمان حریتِ فکر کی لذت سے آشنا تھے۔ وہ اس بات سے خوب واقف تھے کہ خدا کی نگاہ میں تمام انسان برابر ہیں۔ قیادت کی ذمہ داری یا رشد وہدایت کا منصب کسی کو عام انسانوں کی سطح سے اٹھا کر تقدس کے منصب پر فائز نہیں کرتا۔ عام مسلمان اپنے قائدین اور اہل علم پر تنقیدی نگاہ ڈالنا اپنا حق سمجھتے۔ حتیٰ کہ عین خطبہ کے دوران ایک اعرابی عورت خلیفۂ وقت کو ٹوک دینا اپنا حق سمجھتی۔ دوسری طرف قائدین اور اہل علم بھی اپنے آپ کو گوشت پوست کا عام انسان سمجھتے اور اپنے لئے کسی مافوق الفطری القاب کو گوارہ نہیں کرتے اور نہ ہی عام مسلمان اس خیال کے قائل ہوا کرتے کہ وہ اپنے ہی جیسے لوگوں کو تقدس کے ہالے میں گھرا دیکھ سکیں۔ مسلمانوں میں حریتِ فکر کی روایت جب تک باقی رہی ان کی نگاہیں اصحاب علم وفن سے ماوراء، وحی کے اوراق میں ہدایت کی طالب رہیں۔ البتہ جب سے اصحاب علم وفن نے اپنے آپ کو عام انسانوں سے الگ ایک مقدس مخلوق کی حیثیت سے پیش کرنے کی طرح ڈالی اور ان کے ناموں کے آگے پیچھے تقدس مآب القاب وآداب کی طویل قطار وجود میں آنے لگی مسلم ذہن پر تقلید کی دھند دبیز ہوتی گئی۔

آج اگر قرآن مجید کی موجودگی کے باوجود مسلمانوں کو سرنگ کی دوسری طرف روشنی دکھائی نہیں دیتی تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ہمارے درمیان وحی کی عظمت کے مقابلے میں علماء وفقہاء کی عظمت کہیں زیادہ مستحکم ہوگئی ہے۔ ہم قرآن مجید کے راست مطالعے اور اس سے اپنا چراغِ فکر روشن کرنے کے بجائے یہ ضروری خیال کرتے ہیں کہ ہمارے اس خیال کی تائید علمائے قدیم کے اقوال سے ہوتی ہے یا نہیں۔ جن لوگوں کو قرآن کا طالب علم ہونا چاہئے تھا انہوں نے القاب وآداب کے سہارے مخصوص مذہبی لباس کے جاہ وحشم میں خود کو religious authority باور کرا رکھا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہمارے یہاں احبار ورہبان کا ایک طبقہ پیدا ہوگیا ہے۔ آخر اس حیرت انگیز مماثلت کا سبب کیا ہے کہ جس طرح اہل یہود کے علماء خود کو ربائی کہلواتے اور خود کو خدا صفتی کا حامل سمجھتے ہیں اور جس طرح عیسائی علماء نے اپنے لئے Father یا آسمانی باپ کی اصطلاح اختیار کر رکھی ہے، جو صرف خدائے واحد کو زیب دیتا ہے، اسی طرح مسلم علماء نے بھی اپنے لئے مولانا کا لقب اختیار کر رکھا ہے جو خود قرآن مجید میں خدائے وحدہٗ لاشریک کے لئے استعمال ہونے والی اصطلاح ہے۔ جب قومیں اپنے اہل علم کو تقدس کے ہالے میں گھرا دیکھنے کی عادی ہوجاتی ہیں اور جب عام انسانوں کے ذہن پر یہ بات نقش ہوجاتی ہے کہ خود ان کے درمیان بعض لوگوں کا

اندازِ فکر تقدس سے عبارت ہے جس پر تنقیدی نگاہ نہیں ڈالی جاسکتی تو حریتِ فکری کا چراغ گل ہو جاتا ہے۔ ایسی قومیں بحران کے لمحات میں مسائل کا نیا حل ڈھونڈنے اور وحی کی تجلیوں سے اپنی راہوں کو ازسرِ نو منور کرنے کا حوصلہ کھو دیتی ہیں۔ پھر مذہب کے نام پر ہونے والا سارا کاروبار دراصل مذہب کی نفی کرتا رہتا ہے۔ بائبل میں علمائے یہود اور فریسیوں پر حضرت مسیح کی سخت تنقید اسی خیال کی تائید کرتی ہے۔ خود قرآن مجید میں رسول اللہ کی دعوت کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہنا کہ آپؐ لوگوں کی گردنوں کو اصر و اغلال سے نجات دلاتے ہیں، دراصل اسی خیال کو ذہن نشین کرانا ہے کہ خدا نے اپنے دین کی تشریح و تعبیر کا حق کسی طبقہ مخصوص کو نہیں دے رکھا ہے اور یہ کہ محمد رسول اللہ کی دعوت انقلاب کسی رہبانیت، پاپائیت یا مولویت کے ادارے کو برداشت نہیں کر سکتی۔ سچی مذہبیت اور خدا ترسی اس بات کی کیسے اجازت دے سکتی ہے کہ اہل تقویٰ اپنے لئے شرکیہ القاب و آداب کا استعمال روا رکھیں اور جھوٹے تقدس کی یہ غیر صحت مند روایت حریتِ فکر و نظر کا چراغ گل کر دے۔

خدا کے نزدیک اہل یہود ہوں یا ہم مسلمان ہماری فوقیت کا بنیادی سبب تمسک بالکتاب تھا۔ اہل یہود جب تک تورات کو تھامے رہے، تمام اقوامِ عالم پر ان کی فضیلت قائم رہی۔ لیکن جب انہوں نے تورات کے گرد احبار و رہبان کی خودساختہ تاویلات کے پہرے بٹھا دیئے اور جب ان کی مذہبی زندگی میں وحی تورات کے بجائے احبار و رہبان کی فقہ، مشناۃ و گمارا کے مجموعوں اور ملفوظات و ظائف پر مشتمل کتابوں کو کلیدی اہمیت حاصل ہوتی گئی تو ان کا تعلق وحی ربانی سے ٹوٹ گیا۔

ماضی میں مصلحین اسلام کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے بعض امور کو تحقیق و تجزیے سے بالاتر قرار دے رکھا تھا جس پر کسی گفتگو کا دروازہ کھولنا ممنوع سمجھا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر اتحاد امت کے تمام علمبردار اپنے اپنے فقہی دائرۂ کار کے اندر ہی فکری و عملی سرگرمیوں کو روا سمجھتے تھے۔ ائمہ فقہا اور ائمہ محدثین کی عقل و دانش اور ان کے علمی کاموں کو منزل من اللہ کا درجہ حاصل تھا۔

دنیا بھر کے اہل ایمان سوالی ہیں

آخر کب آئے گی خدا کی مدد؟

مسلمان جو منصب سیادت سے اپنی معزولی کے باوجود اب بھی خود کو خیر امت سمجھتے ہیں، اپنے بارے میں طرح طرح کی خطرناک خوش گمانیوں میں مبتلا ہیں۔ صدیوں سے جو قوم اپنے اقوال و اعمال سے شب و روز اس بات اعلان کر رہی کہ ؂

رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی

جذباتی طور پر اب تک وہ اس بات کو تسلیم کرنے کیلئے آمادہ نہیں کہ جس امت پر مشکل گھڑی میں آسمان سے فرشتوں کے نزول کا وعدہ ہے بدقسمتی سے موجودہ مسلمان اب وہ امت نہیں رہے۔ خوب صورت نعتوں کی دلکش آوازوں، سیرت کے جلسہ و جلوس، عبادات کے اجتماعی مظاہرے خواہ ہمیں ہمارے اہل ایمان بنے رہنے پر کتنا ہی یقین کیوں نہ دلائیں، واقعہ یہ ہے کہ ہم اب وہ کچھ نہیں رہے جنہیں ﴿محمد رسول الله والذين معه﴾ کی جماعت کا نام دیا جا سکے۔ پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ صدیاں گزریں جب کبھی ہم سیادت عالم کے منصب پر فائز تھے، ہمارا ملی وجود خیر امت سے عبارت تھا، آخری نبی کی امت کی حیثیت سے تاریخ کے آخری لمحے تک دنیا کی سیادت ہمارے نام لکھ دی گئی تھی۔ سیادت کا یہ منصب ہمیں وحی محمدی کی وجہ سے عطا ہوا تھا۔

وحی کی تجلی جب تک ہماری راہوں کو منور کرتی رہی ہم تاریخ کی لگام سنبھالے رہے۔ دنیا میں واقعات کا رخ ہماری مرضی سے متعین ہوتا تھا اور جب کبھی دشوار لمحات میں ہمیں واقعات پر اپنی گرفت ڈھیلی محسوس ہوتی تو بے ساختہ ہماری نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ جاتیں۔ ہم خدائے قادر مطلق سے اضافی مدد کے طالب ہوتے اور عین پریشان کن لمحات میں حیرت انگیز طور پر اپنے خدا کی نصرت کو موجود پاتے۔ بدر کے معرکے میں تو خود ذات ختمی رسالت موجود تھی جس نے مٹھی بھر اہل ایمان کی نصرت کے لئے رب ذوالجلال کی نصرت چاہی تھی لیکن اہل ایمان کے بعد کے معرکے بھی خواہ وہ ایران وروما کی سلطنتوں کا سرنگوں ہونا ہو یا بعد کے عہد میں اسپین کے ساحل پر کشتیاں جلانے کا واقعہ، ان تمام لمحات میں مسلمانوں کو ہمیشہ یہ محسوس ہوتا رہا کہ ایک زندہ اور متحرک

خدا ان کی نصرت کیلئے ہمہ وقت موجود ہے، جس کے بل بوتے پر وہ بڑی سے بڑی مہم جوئی کا خطرہ مول لے سکتے ہیں۔ معروف ایرانی فوجی جرنیل ہرمزان جب گرفتار ہو کر حضرت عمرؓ کے سامنے آیا تھا تو اس نے اسی بات کی شہادت دی تھی۔ اس نے کہا اے عمر! جب تک قوت کا قوت سے مقابلہ تھا تم ہمارے مقابلے میں کسی شمار و قطار میں نہ تھے لیکن آج خدا تمہاری طرف ہے اور خدا جس کی طرف ہو اس پر کون غالب آسکتا ہے؟

اس میں شبہ نہیں کہ ہم ہی وہ لوگ ہیں جو کل خدا کی نصرت کے بھروسے سے بڑی سے بڑی معرکہ آرائی سر کیا کرتے تھے۔ لیکن اب آخر کیا بات ہے، صدیاں گزریں ہم نصرت خداوندی کی اس لذت سے نا آشنا ہیں۔ دین کے لئے مرنے مٹنے والوں کی آج بھی کمی نہیں۔ دنیا کے مختلف خطوں میں حزب اللہ، جنداللہ، اسلامی جہاد، جماعت اسلامیہ، مجاہدین اسلام، سپاہ صحابہ، فوج محمدی اور نہ جانے کن کن ناموں سے اسلام کے لئے جان دینے والے موجود ہیں۔ دنیا کا کون سا خطہ ہے جہاں محمدؐ کے نام لیواؤں نے اپنے خون سے عزیمت کی داستان نہ لکھی ہو۔ لیکن اب ہر چھوٹے بڑے معرکہ میں صاف محسوس ہوتا ہے جیسے شکست ہمارا مقدر بن گئی ہو۔ خدا جو آج بھی قادر مطلق ہے اور جو چشم زدن میں حالات کا رخ پھیر سکتا ہے مسلمانوں کی مدد کو نہیں آتا۔ حالانکہ گریہ وزاری کی محلفیں سب سے زیادہ اسی قومِ مسلم کے درمیان سجائی جاتی ہیں، نالے سب سے زیادہ یہیں بلند ہوتے ہیں اور کیوں نہ ہو جب صدیوں سے یہ امت آگ وخون کے سمندر میں غوطے لگا رہی ہو، جب اس پر لحہ لحہ عذاب کر دیا گیا ہو اور جب ہر سو ایک قیامت انگیز کہرام بپا ہو۔ محشر کی اس گھڑی میں آخر پکارنے والے کسے پکاریں؟ مسجدیں اب پہلے سے کہیں زیادہ آباد ہیں۔ اصلاحی اور تبلیغی تحریکوں نے نماز وروزے، شب بیداری اور مراقبہ کا وافر ماحول تیار کر دیا ہے۔ سنن ونوافل پڑھنے والوں اور شب وروز اوراد ووظائف پڑھنے والوں کی بھی کمی نہیں۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ امت کے اس عمومی اضطراب اور بے بسی کے باوجود خدائے واحد کی توجہ ہماری طرف نہیں ہوتی؟

یہ وہ سوال ہے جس نے ہر خاص وعام کو مضطرب کر رکھا ہے۔ بڑے بڑے ذہنوں پر کنفیوژن کی آندھیاں چل رہی ہیں۔ چند سال پہلے افغانستان پر امریکی حملے کے دوران جب افغانیوں نے غیرت کا سودا کرنے سے انکار کر دیا اور جس کے نتیجے میں انہیں امریکی افواج کی جارحیت کا سامنا کرنا پڑا، آسمان سے B-52 طیارے موت برسانے لگے، ان چند ہفتوں میں شاید ہی کوئی گیا گزرا مسلمان بھی ہو جس نے رورو کر بارگاہِ خداوندی میں دعائیں نہ مانگی ہوں۔ کیا مشرق کیا مغرب، کیا شیعہ کیا سنی، پوری مسلم دنیا بیک آواز چیخ اٹھی: بارالٰہا! اس مجبور وبے بس امت کی خبر گیری کر۔ مسجدیں قنوت نازلہ کی آہ وبکا سے گونج اٹھیں۔ حتی کہ ان مسلمانوں نے بھی جنہوں نے کبھی مسجد کا رخ نہیں کیا تھا، اپنی پیشانیوں سے سجدہ گاہوں کو آباد کر ڈالا۔ افغانیوں نے کمال استقامت کا مظاہرہ کیا۔ آسمان سے برستی مسلسل موت بھی ان کے پایہ استقامت کو نہ ڈگمگا سکی۔ تب پوری دنیا کو ایسا لگتا تھا

گویا کوئی معجزہ ہونے کو ہے۔ ایاّم ہفتوں میں بدلتے گئے، کوئی معجزہ تو کیا ہوتا، ہاں مسلمانوں کی شکست نمایاں ہونے لگی۔ افغانستان میں جو کچھ ہوا اس نے اہل ایمان کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ خداوند وہاں بھی مسلمانوں کی مدد کو نہیں آیا۔ امت ایک گہری مایوسی میں ڈوب گئی۔ ۱۲۵۸ء میں سقوط بغداد کے بعد مسلمانوں کی تاریخ میں یہ دوسرا واقعہ تھا جب ان کا جذباتی وجود کا ملاً ڈھہ کر رہ گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے اب کوئی نئی صبح اس امت کی زندگی میں کبھی نہ آئے گی۔

ہم من حیث القوم تاریخ کے ہر نازک لمحے میں ﴿نصر من الله وفتح قريب﴾ کا علم بلند کرتے رہے ہیں۔ ہم نے اپنی بساط بھر حالات کا مقابلہ کرنے اور اسے بدل ڈالنے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ لیکن نصرت الٰہی کی لذت سے ہمارے حواس ناآشنا رہے۔ پچھلے دنوں عراق میں امریکی ٹینکوں کی پیش قدمی کے دوران جب تیز ریگستانی آندھی اٹھنے لگی تھی تو ہم مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ایسا لگا گویا اب خدا کی مدد آ پہنچی ہے مگر جلد ہی خوش فہمیوں کے ان غباروں سے بھی ہوا نکل گئی۔ سقوط بغداد نے ایک بار پھر اس تلخ حقیقت سے پردہ اٹھا دیا کہ خدا اب ہماری طرف نہیں ہے اور جب تک کسی امت کو تائید غیبی حاصل نہ ہو، خدا کی پشت پناہی کے بغیر شکست اس کا مقدر ہے، صدیاں گزریں ہم ہر روز ایک نئے سقوط سے دوچار ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے ہر لمحہ ہمارے اندرون میں کچھ ڈھہ رہا ہے۔ ہمارا مجموعی وجود اس صورتِ حال پر سخت مضطرب ہے۔ آخر کب آئے گی خدا کی مدد؟

ہمارے فقہاء ومفسرین اس سوال کا صحیح تجزیہ کرنے اور اس کا مدلل جواب فراہم کرنے کے بجائے قرآنی آیات کی غلط تاویل کے ذریعے ہمیں مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے بقول یہ ساری مصیبتیں دراصل اہل ایمان کی حیثیت سے ہماری آزمائش ہیں ﴿ام حسبتم ان تدخلوا الجنة ولمّا يأتكم مثل الذين خلوا من قبلكم مستهم البأساء والضراء وزلزلوا حتى يقول الرسول و الذين ء امنوا معه متىٰ نصرالله ألا إن نصرالله قريب﴾ (البقرة:٢١٤) کا مطلب انہوں نے یہی سمجھا ہے کہ دنیا تو ہے ہی مسلمانوں کے لئے مصائب وآلام کی جگہ۔ یہاں کافروں کی چاندنی ہے۔ مسلمانوں کیلئے چونکہ آخرت کی ضمانت ہے اس لئے انہیں دنیا میں ان دل گرفتہ حالات پر صبر وسکون سے کام لینا چاہیے۔ بعض گروہوں نے صورت حال کی شدت سے تنگ آ کر ترک دنیا کو باقاعدہ مذہبی رویے کی حیثیت دے رکھی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے ترک دنیا ممکن نہیں۔ جہاں شب وروز ہمارا وجود انہدام کا شکار ہو، ہم میں سے کتنے لوگ غور وفکر سے منہ موڑ کر شترگربگی اختیار کر سکتے ہیں اور کب تک؟ پھر قصہ یہ ہے کہ ذلت کی یہ زندگی اور پے در پے شکستوں کا یہ عذاب ہماری اس تاریخ سے میل نہیں کھاتا جس میں مسلمانوں کی وہ نسل رہتی تھی جس کی مسلمانیت اور اطاعت گزاری پر ہم آج بھی عش عش کرتے ہیں اور جنہیں ہم اپنی زندگی میں رول ماڈل کے طور پر برتنے کے متمنی ہیں۔ بھلا محمدؐ رسول اللہ اور انکے اصحاب سے بڑا مسلمان اور کون ہوگا۔ ان پر نازک لمحات ضرور آئے لیکن ذلت کی زندگی اور شکستوں کے عذابِ مسلسل سے انہیں واسطہ نہ پڑا۔ ہماری تاریخ تو ہمیں یہ بتاتی

ہے کہ اہل ایمان کے لئے دنیا میں بھی سرفرازی کا وعدہ ہے اور آخرت تو ان کے لئے ہے ہی محفوظ۔قرآن کے صفحات اسی بات پر گواہ ہیں کہ تاریخ کے ہر دور میں اہل ایمان کو آخرت کی بشارت کے ساتھ ساتھ دنیا کی سیادت بھی عطا کی گئی۔داؤد وسلیمان کی پر شکوہ سلطنت کے تذکرے اور بنی اسرائیل کو تمام عالم پر فضیلت عطا کرنے کی باتیں ہمیں یہی تو بتاتی ہیں کہ ہم خدا کی پارٹی میں آ گئے تو دنیا ہماری مٹھی میں آ جاتی ہے کہ ایسا پہلے بھی ہوا ہے اور اسی کی بشارت قرآن مجید میں موجود ہے۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ صدیاں گزریں ، ہر مشکل مرحلے میں ''الا ان نصر اللہ قریب'' کی بشارت کسی فیصلہ کن مرحلے سے پہلے ہی دم توڑ دیتی ہے اور ہماری جدوجہد نصرت الٰہی سے محروم ایک نئی داستانِ عبرت پر ختم ہو جاتی ہے۔واقعات تو یہی بتاتے ہیں کہ خدا جس قوم کی مدد کو آئے ،جس کا رفیق ومعاون بن جائے وہ اب ہم نہیں۔

زوال کی صدیوں میں ہمارے ہاں ایک اہل فکر شاعر پیدا ہوا جس نے خدا کے دست شفقت اٹھائے لینے پر شکایات کا انبار لگا دیا۔اس میں شبہ نہیں کہ اس شوخ وشنگ شاعر کی شکایت حقیقت واقعہ تھی۔

رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

البتہ اس صورت حال کے مداوا کیلئے شاعر نے جو جواب تلاش کیا وہ اتنا ہی روایتی تھا جسے مختلف قالب میں ہمارے علماء سابقین پیش کرتے آئے ہیں۔صبح کی بیداری،خدا کی دلداری،اس تک پلٹنے کی باتیں فی نفسہٖ ان جوابات کی صحت پر کسے شبہ ہو سکتا ہے۔البتہ ان صحیح جوابوں کی موجودگی کے باوجود اگر ہمارا ملی قافلہ نصرت الٰہی کے حصول میں ناکام رہا تو اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہم رجوع الی اللہ کو عرصے سے بعض رسوم عبادات میں دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔اس لئے رجوع الی اللہ کی ہماری تمام تر کوشش بھی ہمیں خدا کی مدد کا مستحق نہیں بناتی۔نصرت کا قرآنی وعدہ ہم سے بہت دور رہ جاتا ہے۔ پھر فطری طور پر مضطرب دل ودماغ میں یہ اندیشے جنم لیتے ہیں آیا خدا ہے بھی یا نہیں؟ کہاں ہے وہ خدا جس نے مؤمنوں کی مدد کا وعدہ کر رکھا ہے۔

جب واقعات مسلسل اس بات کی شہادت دے رہے ہوں کہ خدا نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا ہے تو ہم نصرتِ الٰہی کے بھروسے جینے والے لوگوں کے لئے لازم ہے کہ اس سوال کا فی الفور جواب فراہم کریں اولاً ایسا کیوں ہوا اور ثانیاً یہ کہ دوبارہ نصرت خداوندی کا سزاوار بننے کیلئے ہمیں کیا کرنا ہوگا۔گویا من حیث القوم ہمیں اپنے اجتماعی وجود کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔جب تک ہم اپنے حال پر سوالیہ نشان نہیں لگاتے ،مستقبل کیلئے راستہ ملنا ممکن نہیں۔

پہلی بات تو یہ سمجھ لینے کی ہے کہ ہم خواہ محمد رسول اللہ سے اپنا کتنا ہی تعلق کیوں نہ بتائیں واقعہ یہ ہے کہ فکری اور عملی طور پر ہم اصحابِ رسول کی جماعت سے بس واجبی سی نسبت رکھتے ہیں۔وہ جس اسلام کے پیروکار تھے وہ کچھ اور تھا۔ان کی جگمگاتی زندگی

قرآن مجید کے صفحات میں جھلکتی تھی۔ہم نے اپنی مذہبی زندگی کی تعمیر میں قرآن کے بجائے بھانت بھانت کی خودساختہ کتابوں کو اپنا معاون بنا رکھا ہے۔ وہ عبودیت کی لذت سے آشنا تھے، ہم رسومِ عبودیت میں پھنس کر رہ گئے ہیں۔ وہ خیرامت تھے جن کی ہاتھوں میں تاریخ کی لگام تھمائی گئی تھی۔ہم خیرامت کی خوش گمانیوں میں مبتلا عملی طور پر اس منصب سے معزول تاریخ کے قیدی بن کر رہ گئے ہیں۔ ہمارا حال اہل یہود سے کچھ مختلف نہیں جو اپنی معزولی کے باوجود آج بھی خود کو Chosen People سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔جن کے ہاں دین داری نام ہے رسومِ دین داری کا اور چونکہ خالی خولی رسوم وہ نتائج پیدا نہیں کر سکتے جو زندہ دین داری پیدا کر سکتی ہے، اسلئے مذہب کی طرف ہماری تمام تر واپسی کے باوجود مطلوبہ نتائج پیدا نہیں ہوتے۔آج اس امت میں ارکانِ اسلام پر عامل شب بیدار مسلمانوں کی کمی نہیں۔ مابعد استعمار عہد میں مسجدیں کہیں زیادہ آباد ہیں۔ مدارس کی تعداد روز افزوں اضافے پر ہے۔مسلمان نوجوانوں میں دین کی طرف واپسی دنیا بھر میں ایک محسوس عمل کی حیثیت سے واشگاف ہے۔پھر بھی یہ رسومِ دین داری ہمیں نصرت خداوندی کا حقدار نہیں بناتی اور خدا ہماری مدد کو نہیں آتا تو یہ بات غور کرنے کی ہے کہ ہم جسے دین داری سمجھ بیٹھے ہیں یہ سب کچھ اللہ کو واقعی مطلوب ہے بھی یا نہیں۔

نصرت خداوندی کے غیاب میں ہماری آہ و بکا کو بہتر طور پر سمجھنے کیلئے اہل یہود کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ایسا اس لئے بھی کہ قرآن مجید بار بار انحراف یہود کے حوالے سے ہمیں بے جان رسوم عبودیت سے متنبہ کرتا ہے۔اہل یہود جنہیں ہم مسلمان مغضوب الغضب اور راندۂ درگاہ قوم کی حیثیت سے جانتے ہیں، انکی مذہبیت کا یہ عالم ہے کہ وہ زندگی کے ہر معاملے میں باریک سے باریک تفصیل بھی اپنے ربائیوں اور فقہاء سے معلوم کرنا لازم خیال کرتے ہیں۔یومِ کافور کی تفصیلات ہوں یا آدابِ سبت، یا حلالِ ذبیحہ کا معاملہ، مذہبی یہودی جس باریک بینی کے ساتھ تلمودی رسوم کو انجام دینا ضروری سمجھتا ہے اسے دیکھ کر تو دوسروں کو بھی یہ لگتا ہے کہ اس سرزمین پر شاید ہی کوئی گروہ ایسا ہو جو اپنی زندگی میں مذہب پر اس قدر عامل ہو۔اہل یہود آج بھی یہ سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کی منتخب قوم ہیں جنہیں اللہ نے اقوام عالم پر فضیلت دی ہے چونکہ وہ حامل تورات ہیں اور یہ وہ منصب ہے جس کے حوالے سے وہ خدا کے چہیتے ہیں۔پھر بھلا خدا ان کی خبر گیری نہ کرے تو کس کی کرے گا۔نازی جرمنی میں یہودیوں کے خلاف جب عمومی نفرت کا لاوا پھوٹ پڑا اور خدا کے ان خودساختہ چہیتوں پر جب خدا کی زمین تنگ ہونے لگی تو مذہبی یہودی دانشور پکار اٹھے کہ آخر خدا اپنے چہیتوں کو اس طرح ختم ہوتے ہوئے کیسے دیکھ سکتا ہے۔کسی نے کہا تورات کے الفاظ میں قوتوں کا پوشیدہ خزانہ موجود ہے۔اگر مخصوص آیات کی مسلسل تلاوت کی جائے تو حالات بدل سکتے ہیں۔کسی نے قبالائی نقوش کا سہارا لیا، کسی نے ربائی ادب سے اپنا تعلق جوڑا اور کسی نے اجتماعی ذکر و مراقبے کی مجلسیں آباد کر ڈالیں۔ جوں جوں جرمنی اور اس سے متعلقہ علاقوں میں اہل یہود پر زمین تنگ ہوتی گئی، ان کی مذہبی زندگی کا احیاء نمایاں ہونے لگا۔حتیٰ کہ عقوبت گاہوں اور concentration)

camps) میں یہ منظر دیکھنے کو ملا کہ کوئی کھڑے کھڑے کسی ذکر میں مشغول ہے تو کوئی زیر لب کسی ورد میں مصروف۔ حتیٰ کہ ان کیمپوں میں جہاں کھانے کیلئے روٹی کے چند نوالے اور جسم پر ڈھنگ کا لباس نہ رہ گیا تھا، وہاں بھی یہودیوں نے محافظوں کو رشوت دے کر اگر کچھ حاصل کرنا ضروری سمجھا تو وہ دعاؤں کی کتابیں Siddur تھیں جن پر وہ اجتماعی اور انفرادی طور پر عمل پیرا تھے۔ یہ مذہبی کتابیں جب تلاشی کے دوران ضبط کر لی جاتیں اور انہیں یہودیوں کی نگاہوں کے سامنے نذرِ آتش کر دیا جاتا تو مذہبی یہودی پکار اٹھتے کہ کیا ان وظائف کی کتابوں کے بغیر دنیا باقی رہ سکے گی؟ بعض یہودی زاہد، یہ سمجھتے تھے کہ اگر تورات کے بعض حصوں کو استغراق کے ساتھ مسلسل پڑھا جائے اور پھر خدا سے نصرت کی طلب کی جائے تو اس کی مدد کا آنا یقینی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک عقوبت گاہ میں بالآخر ایک ایسے زاہد کو ایک خندق میں، جہاں مردے پھینک دیے جاتے تھے، ایک گوشۂ عافیت مل گیا۔ وہ مسلسل وہاں اوراد و وظائف میں مشغول رہا۔ یہاں تک کہ اس خندق کا نام لوگوں نے بیت مدراش رکھ دیا۔ لیکن ان مسلسل دعاؤں اور سخت مجاہدے کے باوجود خدا ان کی مدد کو نہ آیا۔

رسومِ عبودیت کی اس سے بڑی مثال کیا ہوگی کہ اہل یہود نے ان سخت حالات میں بھی مذہبی زندگی کے ارکان پر عامل رہنے کی بھرپور کوشش کی۔ کہیں سے ایک ٹفلن کا جوڑا مل جاتا یا نمازی شال (tillet) ہاتھ لگ جاتی تو ان کی مایوس زندگی میں مسرت کی ایک لہر دوڑ جاتی۔ باری باری سے وہ ٹفلن لگا کر عبادت کرتے۔ حتیٰ کہ ایک کیمپ سے دوسرے کیمپ تک پیدل مارچ میں بھی وہ اس بات کا اہتمام کرتے کہ ان میں کوئی تلمود کا عالم ہو تو وہ فقہ یہود کا درس جاری رکھے۔ عقوبت گاہوں میں جب بھی محافظوں کی آمد و رفت کم ہوتی، یہودی اجتماعی طور پر ان لوگوں سے تورات و مشنات کا زبانی درس سنتے، جو اپنے حافظے میں ان مذہبی کتب کو محفوظ رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ Maidanek کے کیمپ میں جہاں تین ہزار یہودی رکھے گئے تھے، ان میں بہت کم ایسے لوگ تھے جو روز اجتماعی عبادت میں شریک نہ ہوتے ہوں، کوڑے کے ایک ڈھیر پر جب ایک دن تلمود کا صفحہ کسی کو نظر آ گیا تو ان قیدیوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اسی کیمپ میں موجود ربائی اسحاق ذنبہ تلمود کے اس صفحہ کا باقاعدہ درس دیتے۔ گو کہ ان کیمپوں میں ان کی مذہبی کتابیں ضبط کر لی جاتی تھیں، لیکن ان کی مذہب سے وابستگی کا یہ عالم تھا کہ ان لوگوں نے مختلف چیزوں کو جن کاغذات میں لپیٹ رکھا تھا وہ تلمود کے صفحات ہی تھے جو لوگ کھانے کے چند نوالوں کے لئے مدت سے ترسائے گئے ہوں ان کی مذہب سے وابستگی کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی موقع ہاتھ آتا تو وہ محافظوں سے اپنے کھانے کے بدلے یا اپنے دانتوں میں لگے سونے کے بدلے تورات کا کوئی نسخہ، وظیفہ کی کوئی کتاب، Siddur کا کوئی ایڈیشن خرید لیتے۔ اتنی سخت مذہبیت کے باوجود ان کی چیخ و پکار رائیگاں گئی۔ خدا کے یہ خود ساختہ چہیتے رسوم بندگی کے ان تمام مظاہروں کے باوجود اس کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

جرمنی کی مختلف عقوبت گاہوں بالخصوص Auschwitz میں اہل یہود پر جو گزری اس سے پوری قومِ یہود دہل گئی۔ کہتے ہیں کہ یورپ کی دوتہائی یہودی آبادی نازیوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتاردی گئی۔ یہ سب کچھ چشم زدن میں نہیں ہوگیا۔عقوبت گاہوں کی کہانیاں اورموت گاہوں کے لرزہ انگیز مناظر جب عام ہوتے گئے اور یورپ کے یہودیوں کوصاف محسوس ہونے لگا کہ ان کا من حیث القوم خاتمہ اب چند دنوں کی بات ہے۔وہ مسلسل اپنے آپ سے پوچھا کئے، کیا خدا ہم چہیتوں سے اپنی دنیا خالی کرلے گا؟ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم جو تورات کے حاملین ہیں، ہم جولمحہ تلمود پر عمل پیرا ہیں، ان کے وجود سے دنیا خالی ہوتی ہوئی نظر آئے اور پھر بھی خدا کی رحمت کو جوش نہ آئے۔ بعض دلوں میں یہ شکوک بھی جنم لیتے آیا خدا ہے بھی یا نہیں؟ بنو اسرائیل کی عظمت کا فسانہ جواب تک سنا کئے تھے، یہ سب خواب وخیال کی باتیں تو نہیں؟

سچ پوچھئے تو Auschwitz نے اہل یہود کی مذہبی فکر کو ایک بحران سے دوچار کردیا۔لیکن تب بھی مقدس ماضی میں جینے والی یہ قوم اپنی مذہبی زندگی کے احتساب پرآمادہ نہ ہوئی۔ یہ پہلا واقعہ نہیں تھا جب یہود کسی بڑے حادثے سے دوچار ہوئے ہوں، حضرت مسیح کی آمد کے بعد ہیکل سلیمانی کی دوبارہ تباہی اورتب سے اب تک ان کی ملی زندگی ایک عذاب مسلسل سے عبارت رہی ہے۔ وہ جہاں بھی گئے وہاں ذلت کے عذاب میں مبتلا رہے۔ابھی ان کے قدم جمنے بھی نہ پاتے کہ وہ ان علاقوں سے ذلت کا عذاب لیے نکلنے پر مجبور ہوتے۔ صاف محسوس ہوتا کہ جب خدا کسی قوم سے اپنا دست شفقت اٹھالے تو پھر اسے جہاں میں کہیں امان نہیں ملتی۔ان کے اندر علماء ودانشور، اہل حرفت اورعقل وخرد رکھنے والوں کی کمی نہ تھی۔ وہ زبردست محنت کے عادی تھے۔ دل ودماغ کی فطری صلاحیتوں میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہ تھے۔ دنیا کمانے اوراس کے استعمال کا بھی انہیں خوب فن آتا تھا لیکن جب خدا ہی اپنا دستِ کرم اٹھالے تو یہ بہترین انسانی صلاحیتیں بھی کام نہیں آتیں۔لیکن افسوس کہ ان کے ذہین ترین افراد بھی دیوار پر لکھی اس واضح تحریر کو پڑھنے میں ناکام رہے۔خود کو داؤدسلیمان کی سلطنت کا وارث سمجھنے والے اہل یہود آج بھی اس خام خیالی میں مبتلا ہیں کہ وہ خدا کے برگزیدہ بندے ہیں جن کے بغیر تاریخ کا سفر بے معنی ہے بلکہ معاصر تاریخ میں قیام اسرائیل کے بعد ۱۹۶۷ء کی چھ روزہ جنگ میں خوابیدہ عربوں کے طفیل انہیں جو غیر معمولی کامیابی ملی اس سے وہ اس بات کی سند لاتے ہیں خدا دوبارہ ان کی پشت پر موجود ہے۔ حالانکہ ان کے خداترس علماء ہانکے پکارے یہ کہہ رہے ہیں کہ ریاست اسرائیل کا وجود تلمودی فقہ سے ہم آہنگ نہیں اور نہ ہی اس ریاست میں تورات کی تعلیمات کا شائبہ بھی پایا جاتا ہے۔ جو ریاست دجل وفریب، ظلم وبربریت سے غذا حاصل کرتی ہو، جہاں تورات کی تعلیمات ریاست کی مصلحتوں میں دفن کردی جاتی ہو، بھلا ایک ایسی غیر توراتی ریاست کی پشت پرخدا کیسے ہوسکتا ہے؟ ماضی میں جینے والی قوم اپنے محاسبے پرآمادہ نہیں ہوتی، اس کی ساری کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ صورت حال کی کوئی ایسی تاویل کرلے جو اسے خود احتسابی سے بچاسکے۔

کھلی آنکھوں اور بیدار دل ودماغ سے دیکھا جائے تو ہم مسلمانوں کا معاملہ بھی کچھ مختلف نہیں۔ بدقسمتی سے ہم بھی تاویلات کے خوگر ہو چکے ہیں۔ ہم اپنی پے درپے ناکامیوں کا احتساب کرنے کے بجائے ایسی تاویلات سے دل بہلانا مناسب سمجھتے ہیں جس سے ہماری تکلیف دہ صورت حال پر پردہ پڑا رہ سکے۔

تاریخ کے اس نازک مرحلے میں اگر ہم بھی اہل یہود کی طرح اپنی خودساختہ تاویلات پر مصر رہے تو ہمارا انجام بھی ان سے مختلف نہیں ہوسکتا کہ خدا کے نزدیک اہل یہود ہوں یا ہم مسلمان ہماری فوقیت کا بنیادی سبب تمسک بالکتاب تھا۔ اہل یہود جب تک تورات کو تھامے رہے، چہار دانگ عالم پران کی فضیلت قائم رہی۔ لیکن جب انہوں نے تورات کے گرد احبار ورہبان کی خود ساختہ تاویلات کے پہرے بٹھا دیئے اور جب ان کی مذہبی زندگی میں وحی تورات کے بجائے احبار ورہبان کی فقہ، مشناۃ وگمارا کے مجموعوں اور ملفوظات وظائف پر مشتمل کتابوں کو کلیدی اہمیت حاصل ہوتی گئی تو ان کا تعلق وحی ربانی سے ٹوٹ گیا۔ انسانی تشریح وتعبیر میں باقی ماندہ تورات کو انہوں نے جس طرح محصور کر دیا اس کے نتیجے میں عبودیت کا چراغ گل ہونا یقینی تھا۔ بندگی غائب ہوگئی۔ رسومِ بندگی ان کا سرمایہ قرار پایا۔ ان رسوم کی ادائیگی میں وہ اتنے پختہ ہوئے کہ انہوں نے معمولی باتوں پر فقہ کی ضخیم مجلدات مرتب کر ڈالیں۔ ربائی تاویلات نے اہل یہود کی مذہبی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ ان کے علماء وفقہاء یہاں تک کہنے لگے کہ خدا نے جب ایک بار تورات ہمارے حوالے کر دیا ہے تو اب اس کی تشریح وتعبیر کا کلی حق بھی ہمیں ہی حاصل ہے۔ موسیٰؑ کے مقابلے میں ربائی اکیوا تورات کے کہیں زیادہ مستند شارح سمجھے گئے۔ فقہاء کا تعمیر کردہ یہ دین آج بلا تکلف ربائی یہودیت سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کہنے کو تو یہ دین موسوی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ باقی ماندہ تورات سے بھی اس کا رشتہ بس واجبی سا ہے۔ فقہائے یہود کا تعمیر کردہ یہ دین وہ نتائج پیدا نہیں کر سکتا جو دین موسوی کا خاصہ رہا ہے۔ دین فقہاء اور دینِ وحی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جہاں وحی فرد کے دل ودماغ سے عبودیت کاملہ کا آبشار بہانا چاہتی ہے وہیں فقہاء کی باریک بینی مظاہر پرستی کا ایک ایسا دفتر مرتب کرتی ہے جس پر عبودیت کا صرف گمان ہوتا ہے۔ وحی تاریخ کا راز افشا کرتی اور اپنے حاملین کو تاریخ کی شاہِ کلید عطا کر دیتی ہے۔ جب کہ فقہاء وربائی اپنی احتیاط پسندی میں مطالب وحی کی ایک ایسی طویل فہرست ایجاد کر ڈالتے ہیں جن کی تفصیلات میں بسا اوقات خود غایت وحی دم توڑ دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ احبار ورہبان پر غیر ضروری انحصار پوری قوم کو وحی کی تجلی سے دور کر دیتی ہے اور مذہبی زندگی کی مشین انسانوں کی مرتب کردہ تعبیر وتشریح کی مرہون منت ہو کر رہ جاتی ہے۔ اہل یہود پر جو گزری سو گزری۔ ان کے اس دردناک انجام میں ہمارے لئے بڑا سبق ہے۔ آنکھیں اگر کھلی ہوں تو اہل یہود سے متعلق عبرت ناک بیانات میں، جس سے قرآن کے صفحات پُر ہیں، ہم اس سوال کا جواب بآسانی تلاش کر سکتے ہیں کہ ہم کیوں معزول ہوئے اور آخر کیوں خدا نے ہمارے اوپر سے اپنا دست شفقت اٹھا لیا ہے۔

دینِ فقہاء اور دینِ وحی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جہاں وحی فرد کے دل و دماغ سے عبودیت کاملہ کا آبشار بہانا چاہتی ہے وہیں فقہاء کی باریک بینی مظاہر پرستی کا ایک ایسا دفتر مرتب کرتی ہے جس پر عبودیت کا صرف گمان ہوتا ہے۔ وحی تاریخ کا راز افشا کرتی اور اپنے حاملین کو تاریخ کی شاہِ کلید عطا کر دیتی ہے۔ جب کہ فقہاء و ربائی اپنی احتیاط پسندی میں مطالب وحی کی ایک ایسی طویل فہرست ایجاد کر ڈالتے ہیں جن کی تفصیلات میں بسا اوقات خود غایت وحی دم توڑ دیتا ہے۔

تقلید اور اصلاح ایک ساتھ نہیں چل سکتے اور نہ ہی تقلید اور تنویر (Enlightenment) کا اجتماع ممکن ہے۔ دانش انسانی کے استعمال میں سابقین کے تجربات سے ہم کسب فیض تو ضرور کر سکتے ہیں البتہ اس بات پر اصرار نہیں کر سکتے کہ اس عمل میں ہمارے اور ان کے نتائج یکساں ہوں۔ اگر نتائج کی یکسانیت کو ہدف قرار دے دیا جائے تو غور و فکر کا سارا سلسلہ لایعنی قرار پاتا ہے۔

پیمبرانہ لب ولہجہ کا غیاب

تاریخ کے آخری پیغمبر محمد رسول اللہ کی حیثیت کافة للناس بشیرا و نذیر ا کی ہے۔انسانی تاریخ کا یہ آخری رسول جب تک اس سرزمین پر موجود رہا، پوری نوع انسانی کو فلاح و کامرانی کی طرف بلاتا رہا۔محمد رسول اللہ کی دعوت میں ایک بین الاقوامی اپیل تھی۔تب اسلام کا مطلب ایک ایسی دعوت سمجھا جاتا تھا، جو انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کرتی۔ بجھے دل اور شکستہ قلوب اسلام کی پناہ گاہ میں سکون و عافیت کا سامان پاتے۔ یہ اسی مسیحانہ آواز کا اثر تھا کہ جزیرۃ العرب سے اٹھنے والی اس آواز نے غیر اقوام کی صالح روحوں کو بھی بہت جلد اپنی جانب متوجہ کر لیا۔صہیب رومی ہوں یا بلال حبشی، سلمان فارسی ہوں یا دیگر غیر عرب افراد، ان سبھوں کو اسلام کی دعوت میں نجات و رحمت کا اتنا ہی امکان دکھتا تھا جتنا کہ عرب ثقافت کے مقامی رہنماؤں مثلا ابوبکر و عمر اپنے لئے اس نوید مسیحائی میں امکانات وا پاتے تھے۔ یہ تھی وہ پیمبرانہ آواز جو رسول اللہ کی زبان مبارک سے بلند ہوئی اور جس نے دیکھتے دیکھتے تمام اقوام عالم کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

آج گو کہ محمدؐ رسول اللہ کے متبعین کی تعداد ۱٫۶ بلین سے تجاوز کر گئی ہے۔اسلام ایک عالمی مذہب کے طور پر جانا جاتا ہے لیکن افسوس کہ کسی گوشے سے وہ پیمبرانہ آواز سنائی نہیں دیتی۔ دنیا اس نوید مسیحائی سے محروم ہے۔مسلمانوں کے تمام ہی بین الاقوامی فورم خواہ وہ تنظیم اسلامی کانفرنس ہو یا رابطہ عالم اسلامی ،عرب لیگ ہو یا عالم اسلام کی دوسری معتبر تنظیمیں ہر جگہ اگر کوئی بحث جاری ہے تو وہ اس بات پر کہ مسلمانوں کو موجودہ معاشی ، سیاسی ،اور تعلیمی پستی سے کیسے نجات دلائی جائے۔اقوام عالم کے درمیان مسلم قوم کا وقار کس طرح بلند ہو۔رہی یہ بات کہ عالم انسانیت کو درپیش بحران مثلاً ماحولیات کی تباہ کاری، اسلحوں کی دوڑ، ایٹمی جنگوں کے خطرات ، استحصالی سرمایہ دارانہ نظام کے کستے شکنجے ، دولت کا چند ہاتھوں میں ارتکاز ، بین الاقوامی کمپنیوں کی اجارہ داری، آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کا نظام استحصال اور گلوبلائزیشن کے ذریعہ پوری دنیا پر کستے شکنجے ، جیسے خطرات کے سلسلے میں مسلم دنیا سے کوئی ایسی مؤثر آواز بلند نہیں ہو رہی ہے جس پر دنیا کے کان کھڑے ہو سکیں ، یا جس کے سبب دیگر اقوام کے یہاں یہ تاثر پیدا ہو کہ ہم اپنی ناک سے آگے بھی دیکھتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ آج اسلام ایک ایسے نظریہ کے طور پر سامنے آیا ہے، جو صرف مسلم فرقہ کے مفادات کا تحفظ کر سکتا ہے، بھلا کسی ایسے اسلام میں دیگر اقوام کے لئے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔اسلام کے اس فرقہ

وارانہ ایڈیشن میں جسے قومی مسلمانوں نے گذشتہ چند صدیوں میں تشکیل دیا ہے، دیگر اقوام کے لئے نہ صرف یہ کہ کوئی کشش نہیں رہ گئی ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ اسلام کو ایک ایسے نظریہ کے طور پر دیکھتی ہے جسے اگر کامیابی مل گئی تو ان کا مستقبل تارتار ہوجائے گا۔ اقوام عالم پر مغربی اقوام کی موجودہ سبقت یکسر ختم ہوجائے گی۔ حالیہ برسوں میں امریکہ کی قیادت میں دہشت گردی کے خلاف جو مہم جاری ہے اس کے پیچھے دراصل قومی اسلام سے متعلق یہی وہ اندیشے ہیں جس نے مغربی دانش وروں کو تہذیبوں کے مابین جنگ کا بگل بجانے پر آمادہ کیا ہے۔

لیکن حقیقت صرف اتنی نہیں، اس مسئلہ پر ایک دوسرے نقطہ نظر سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ حالیہ برسوں میں کمیونزم کے زوال اور سرمایہ دارانہ جمہوریت کی کامیابی نے مغرب میں مابعد تاریخ (post-era sensibilities) کے احساسات کو عام کیا ہے۔

مغربی دانشور یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ایک طویل کشمکش کے بعد بالآخر جمہوریت کی فتح نے انسانی تاریخ کو اس کی منتہیٰ تک پہونچا دیا ہے۔ آگے کی معنویت کے سلسلے میں ان کے ذہنوں میں ایک پراسرار خلا پایا جاتا ہے۔ دوسری طرف اسلامی حلقوں کی جانب سے مزاحمت کا سلسلہ ابھی پوری طرح رکا نہیں ہے۔ اس صورت حال نے مغرب کو شاید یہ سمجھنے پر مجبور کیا ہے کہ مزاحمت کی اس آخری آواز کا قلع قمع کئے بغیر جمہوریت کو مکمل اور حتمی فتح نہیں دلائی جاسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم حلقوں سے اٹھنے والی نسبتاً کمزور اور نحیف آوازوں کو بھی مغرب ایک بڑے خطرے کے طور پر دیکھتا ہے اور بسا اوقات کمزور مزاحمت کو بھی ذرائع ابلاغ اس طرح دکھاتے ہیں گویا اگر اس سے فی الفور نہ نپٹا گیا تو تمام اقوام عالم کا سکون خطرے میں پڑ جائے گا۔ یہ سچ ہے کہ اسلام اور مغرب کی اس کشمکش میں ذرائع ابلاغ دانستہ طور پر اسلام کی شبیہ داغدار کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ البتہ اس پورے منظرنامہ میں جو چیز سب سے زیادہ تشویشناک ہے وہ یہ کہ مسلمانوں کی طرف سے اٹھنے والی ان آوازوں میں کہیں بھی وہ پیمبرانہ وسعت دکھائی نہیں دیتی جو ابتدائی عہد میں مسلمانوں کا خاصہ ہوا کرتی تھی۔ اگر مسلم اہل فکر اور علمائے اسلام اپنی تمام تر توجہ اس بات پر صرف کرتے رہے کہ مسلمانوں کا قومی دبدبہ کس طرح قائم ہو، فرقۂ مسلم کو اقوام عالم میں کس طرح باوقار مقام عطا کیا جائے اور اگر آخری نبی کے متبعین کے حلقوں سے عام انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے ہانکے پکارے آواز لگانے والے معدوم ہوجائیں تو پھر دنیا کو پیمبرانہ آواز کہاں سے سنائی دے گی۔ جب تک اسلام کی دعوت لوگوں کو ایک خدا کی طرف بلاتی رہی، اسی خدا کی طرف جو صرف مسلمانوں کا ہی نہیں بلکہ تمام اقوام عالم کا رب ہے۔ اسلام کی دعوت ایک بین الاقوامی صداقت کا مظہر تھی لیکن جب سے اسلام کو مسلمانوں نے قومی افتخار کے پروجیکٹ میں تبدیل کردیا اسلام عبودیت کے بجائے محض ایک قومی شناخت بن کر رہ گیا، ایک ایسی قومی شناخت جس میں دوسروں کے لئے کوئی کشش باقی نہیں رہ گئی۔

اسلام کے نظری قالب میں تبدیلی یا انحراف کا یہ عمل عہد عباسی کے ابتدائی ایام میں راہ پانے لگا تھا جب بعض سیاسی عوامل کے زیر اثر ہمارے فقہاء اسلام کو ایک آفاقی پیمبرانہ دعوت کے بجائے مسلم سلطنت کی نظری بنیاد کے طور پر دیکھنے لگے تھے۔ اسی عہد میں دنیا کو دارالاسلام اور دارالکفر کی اصطلاحوں میں دیکھنے کا رجحان تشکیل پایا اور یہ بحث بھی شد و مد کے ساتھ سر اٹھانے لگی کہ مسلمان ہونے کے لئے لازم عقائد کیا کیا ہونے چاہئے۔ خلافت منہاج النبوۃ سے منحرف ہو چکی تھی۔ اولوالأمر کے منصب پر ملوک وسلاطین کی حکمرانی نے اسلام کو ایک ایسی نظری قوت کے طور پر پیش کیا جو مسلم سلطنت کی توسیع کے لئے نظری بنیاد فراہم کرتا ہو۔ اس عہد میں نہ صرف یہ کہ یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ مسلمان کون ہے بلکہ فقہاء نے جمہور مسلمانوں کے لئے اہل سنت و الجماعت کے نام سے عقائد کا ایک بنیادی محضر بھی تیار کر ڈالا۔ خلق قرآن کی بحث صرف فقہی یا فنی موشگافی نہیں تھی بلکہ اس کے ذریعہ سرکاری علماء کو اس بات کا موقع ملا کہ وہ اسلام کی تشریح وتعبیر پر اپنا کنٹرول مستحکم کر لیں اور اس طرح اسلام کو سلطنت کی خدمت پر مامور کرنے کی راہ ہموار ہو جائے۔ گو کہ اس عہد میں ابن حنبل اور دیگر اہل حق اس مہم میں پوشیدہ خطروں کو بھانپ گئے اور اس کے خلاف حتی المقدور مزاحمت بھی کی لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود آفاقی اسلام کو مسلمانوں کے ثقافتی ورثہ میں محدود کرنے سے نہ بچایا جا سکا۔ اسلام ایک پیمبرانہ دعوت کے بجائے مسلم ریاست کے نظری حلیف کے طور پر سامنے آیا اور علماء انبیائی دعوت کے امین بننے کے بجائے اسی منحرف ریاست کے شیخ الاسلام بننے پر قانع ہو گئے۔ قرآن جو کبھی تمام عالم انسانیت کے لئے کتاب بشارت سمجھی جاتی تھی اب صرف مسلمانوں کی مذہبی کتاب بن کر رہ گئی حتی کہ وہ تمام قرآنی آیات جن میں اہل کتاب اور اہل ایمان کے دیگر طائفوں کے لئے ﴿لا خوف علیهم و لا هم یحزنون﴾ کی بشارت دی گئی تھی ہمارے فقہاء نے اپنی فقہی موشگافیوں کے زیر اثر انہیں منسوخ کر ڈالا اور نجات سے متعلق ان نازک اور حساس موضوع پر فیصلہ کرنے بیٹھ گئے جسے خدا نے اپنے خصوصی دائرہ اختیار میں رکھا تھا اور جس کے بارے میں قرآن کا ارشاد تھا ﴿ان الله یفصل بینهم یوم القیامة﴾۔

قرآن کلام اللہ ہے تو کن معنوں میں؟ کیا اللہ نے محمدؐ سے بزبان عربی کلام کیا؟ یا اس نے اپنا پیغام محض اپنے رسول کے قلب پر نازل کیا۔ خدا کا کلام جسے انسانی زبان بیان کرنے سے قاصر ہے ایک انسانی زبان میں کس طرح ظہور پذیر ہوا؟ کیا قرآن کا کلام اللہ ہونا اسی معنوں میں ہے جس طرح حضرت عیسیٰ کو کلمۃ اللہ کہا جاتا ہے یا جسے عیسائی لٹریچر میں Logos سے تعبیر کرتے ہیں؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا براہ راست تعلق اسلام کے اس ایڈیشن سے ہے جو عہد عباسی میں تشکیل پایا تھا اور جو سلطنت کے سرکاری نظریہ کے طور پر معروف ہوا۔ اس میں شبہ نہیں کہ محمد رسول اللہ پر جب خدا نے اپنی وحی نازل کی تو وہ جزیرۃ العرب کا ایک تاریخی منظر نامہ تھا لیکن یہ بھی ایک بدیہی حقیقت ہے کہ آپ کی حیثیت رسول عربی کے بجائے ایک عالمی پیغمبر ﴿کـــــافة للناس بشیرا و نذیرا﴾ کی ہے اور اسی لئے قرآن متبعین محمدؐ کو اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ وہ قومی شناخت قائم کرنے کے بجائے

نظری شناخت کے حامل ہوں۔لیکن ﴿کونوا هودا او نصاریٰ قل بل ملة ابراهيم حنيفا﴾ پر از حد اصرار کے باوجود صبغة الله اختیار کرنے کی طرف ہماری توجہ کم ہی گئی۔لسانی ثقافتی شناخت کے بجائے صبغة الله پر اصرار اور ﴿کونوا ربانیین﴾ کی دعوت اس بات سے عبارت تھی کہ محمد رسول اللہ کے متبعین نہ تو کسی مقامی ثقافت کے اسیر ہوں گے اور نہ ہی کوئی جغرافیائی یا لسانی شناخت ان کا طرۂ امتیاز ہوگی۔لیکن عملاً یہ ہوا کہ عباسی فقہاء کے زیر اثر اسلام کی آفاقی دعوت عروبہ کی سرحدوں میں محدود ہوگئی۔آج بھی یہ سوال اپنی جگہ باقی ہے کہ کیا عرب ثقافت کے بغیر اسلام کا کوئی قالب تشکیل پا سکتا ہے یا یہ کہ قرآن مجید کے معانی عربی زبان کے لغوی اور جاہلی شعری استعمال سے ماوراء سمجھے جاسکتے ہیں یا نہیں۔

بالفاظ دیگر کیا یہ ممکن ہے کہ قرآن مجید کی تشریح وتعبیر میں عربی زبان کی وجہ سے عرب اقوام کو ہمیشہ فوقیت کا حامل بتایا جائے یا غیر عرب اقوام کے لئے بھی یہ ممکن ہے کہ وہ لسانی موشگافیوں سے ماوراء کتاب ہدایت کی حیثیت سے اس پر اتنا ہی حق جتائیں۔ یہ وہ سوالات ہیں جس نے ماضی میں مسلم اہل فکر کو قدرے حیرانگی اور تذبذب میں مبتلا رکھا ہے۔مثال کے طور پر جب محمد اقبال نے خلافت عثمانی کے زوال کے بعد اس امید کا اظہار کیا کہ اب سرکاری تعبیری نظام کے معدوم ہوجانے سے ایک ایسے اسلام کی بازیافت ممکن ہو سکے گی جو عرب ثقافت کی چھاپ سے آزاد ہو تو شاید ان کے ذہن میں اسی آفاقی اسلام کا تصور تھا جو اٹھا تو عرب کی سرزمین سے تھا لیکن اس میں غیر عرب اقوام کے لئے یکساں نجات کی بشارت سنائی دیتی تھی۔اقبال کی توقع کے برعکس ہمارے عہد میں اسلام کے ایک ایسے آفاقی ایڈیشن کی بازیافت، جو عربیت اور دوسرے ثقافتی قالب سے ماوراء ہو، اب شاید اتنی آسان نہیں رہی۔ ہمارے عہد میں زبان کے سلسلے میں بعض ایسے نظریے وضع ہوئے ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ کسی متن میں وہی کچھ نہیں ہوتا جس کا اظہار الفاظ کرتے ہیں کہ ہر قاری کے دل ودماغ میں الفاظ کی جہتیں اور معانی کی پرت مختلف ہوتی ہے۔گویا پڑھنے والا صرف متن ہی نہیں پڑھتا بلکہ اپنے رجحانات کو بھی متن میں پڑھنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ ایک ایسا غیر محسوس عمل ہے جس سے بچنا مشکل ہے۔

Deconstruction کی فلسفیانہ موشگافیوں نے ہمارے بعض مسلم اہل فکر کو غرطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے جس سے اس بات کا اندیشہ پیدا ہو چلا ہے کہ متن کو اپنے اپنے ذہنی رجحانات کے زیر اثر پڑھنے کی یہ لئے ہمیں کہیں اس کے اصل پیغام سے ہی محروم نہ کردے۔

معاصر علماء میں محمد ارکون اور نصر ابوزید ان لوگوں میں سے ہیں جو وحی ربانی کی تشریح وتعبیر میں ان سوالات تک جانکلے ہیں جن کا جواب انسانی عقل فراہم نہیں کرسکتی۔عہد رسول میں بھی جب پوچھنے والوں نے یہ پوچھا کہ خدا کس طرح وحی کا نزول اپنے پیغمبر پر کرتا ہے تو اس بارے میں صرف اتنی بات کہی گئی کہ یہ امر ربی ہے۔گویا سوال کا یہ حصہ کہ قرآن مجید معانی اور متن ہر اعتبار

سے کلام الٰہی ہے اسی پرانی بحث کو تازہ کرتا ہے جو خلق قرآن کے حوالے سے کبھی عہد عباسی میں ہمارے انتشار فکری کا سبب بنی تھی۔ بات یہ ہے کہ نزول وحی کا پورا عمل انسانی حیطۂ ادراک سے باہر ہے۔ یہ وہ ممنوع وادیاں ہیں جن میں ہمارا داخلہ قرآن اور وحی کی تعبیر و تفہیم میں مدد کرنے کے بجائے ہمارے ہوش و حواس کو بری طرح مجروح کر دیتا ہے۔ ایک ایسے وثیقۂ وحی کو جو فی نفسہ لازوال ہو زمان و مکان کی قیود سے ماوراء سمجھنے کی کوشش مستحسن سمجھی جائے گی، البتہ انسان جو زمان و مکان کا قیدی ہے اس عمل سے پوری طرح عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ ہم زیادہ سے زیادہ جو کر سکتے ہیں وہ یہ کہ نئے سیاق میں اس کتاب ہدایت کو از سر نو سمجھنے کی کوشش کریں اور معانی کی ان تہوں تک پہونچنے کی کوشش کریں جہاں ہمارے متقدمین بوجوہ پہونچنے سے قاصر رہے تھے۔ قرآن بلاشبہ ایک لازوال وثیقۂ وحی ہے لیکن اس کے تمام ابعاد کی تفہیم کے لئے یہ ممکن نہیں کہ ہم عہد رسول کے زمان و مکان کے ابعاد سے صرف نظر کرسکیں۔ deconstruction age کے معاصر مفکرین جن میں محمد ارکون سرفہرست ہیں محض اس بات کی دعوت نہیں دے رہے ہیں کہ متن وحی کا نئے علوم مثلاً Anthropology اور Sociology کی روشنی میں مطالعہ کیا جائے بلکہ وہ اپنی سادہ لوحی میں ان ممنوع وادیوں میں جا نکلے ہیں جہاں فرشتوں کے پر جلتے ہیں اور جس کا سیدھا سا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی محدود دماغی ساخت کے ذریعہ وحی جیسے ماورائے ادراک عمل کو اپنے حیطۂ ادراک میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ارکون کے یہاں طریقہ ترسیل کو سمجھنے کی لمبی چوڑی تھکا دینے والی بحثوں کے باوجود قاری کو جدید لسانیاتی نظریوں اور فیشن ایبل اصطلاحوں کے علاوہ کچھ اور ہاتھ نہیں آتا۔

عہد رسول میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جو طریقہ ترسیل کے عمل میں تاک جھانک کی نفسیات کا مظاہرہ کرتے ہوں، جیسا کہ قرآن ہمیں بتاتا ہے۔ پوچھنے والوں نے پوچھا ﴿یسئلونك عن الروح﴾ اے محمد وہ تجھ سے نزول وحی کی بابت پوچھتے ہیں۔ ﴿قل الروح من امر ربی﴾ کہہ دیجئے ترسیل وحی بس امر ربی ہے، منشاء الٰہی ہے۔ (الاسراء:۵۸)۔

ایک دوسرے سیاق میں قرآن نے ترسیل وحی کے تین طریقوں کا تذکرہ کیا ہے لیکن وہاں بھی فی نفسہ اس طریقہ کی سریت سے پردہ نہیں اٹھایا گیا۔ شاید خدا اس راز کو بندوں پر افشا کرنا نہیں چاہتا۔ یا نزول وحی کا یہ سارا عمل اتنا پیچیدہ ہے کہ انسانی عقل اس کا احاطہ نہیں کرسکتی اور یہ کیونکر نہ ہو خدا کے کلام کو جو ایک ایسی ہستی ہے جس کا کوئی شئے احاطہ نہیں کرسکتی، انسانی زبان میں ڈھالنا لامکان سے مکان کی طرف ایک ایسا سفر ہے جس کا احاطہ انسانی عقل کے بس کی بات نہیں۔ سریت کے اس پردے کے پیچھے کیا ہے اس بارے میں ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ واللہ اعلم۔

قرآن مجید کی ایک ایسی تعبیر جو عرب تاریخی اور ثقافتی پس منظر سے ماوراء ہو لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کا رشتہ زمانی اور مکانی طور پر عہد رسول کی عربی ثقافت سے پوری طرح منقطع نہ ہوا ہو ہمیں ایک ایسے اسلام کی بازیافت سے دوچار کرسکتا ہے جسے ہم

اسلام کی سچی تعبیر کہہ سکیں۔ طریقۂ ترسیل کے سلسلے میں ہمارا تجسس یقیناً ہمیں وحی کو سمجھنے میں کچھ زیادہ مدد نہیں کرتا اس کے برعکس ہمیں اپنی ساری توجہ اس امر پر مرکوز کر دینی چاہئے کہ متن کو اپنے عہد میں کتاب ہدایت کے طور پر کس طرح پڑھا جائے تا کہ متقدمین کی طرح ہماری موجودہ نسل بھی اپنے عقل وادراک کی تمام تر پونجی وحی کو سمجھنے میں صرف کر سکے۔ گویا ہم جیتے تو موجودہ زمانے میں ہوں لیکن ہمیں عہد رسول میں مکانی سفر کا سلیقہ آتا ہو۔ تفہیم وحی کا یہی وہ منہج ہے جس کے ذریعے آج ہماری اس پیمبرانہ آواز تک رسائی ہوسکتی ہے۔

قرآن یقیناً خدا کے الفاظ پر مشتمل ہے لیکن یہ الفاظ مردہ نہیں ہیں۔ یہ مسلسل نمو پذیر ہیں۔ یہ ایک ایسا prism ہے جس کے ذریعہ ہم ہر عہد کو مختلف روشنیوں میں گھرا دیکھتے ہیں۔ یہاں ماضی اور حال مجسم نظر آتا ہے۔ وحی کا یہ دفتر ہم سے اس بات کا طالب ہے کہ ہم اس کے مطالعہ میں اپنی تمام تر علمی فکری اور ذہنی توانائیاں صرف کر دیں۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ قرآن جیسی عظیم شئے عام انسانوں سے اس بات کی طالب ہوتی ﴿أفلا يتدبرون القرآن أم على قلوب اقفالها﴾ (محمد: ٢٤) جو لوگ الفاظ قرآنی کو ایک ایسا مجموعۂ عبارت سمجھتے ہیں جو لغت کے ڈھانچہ سے اپنی آخری شکل میں نکل چکا ہے وہ پھر اس بات پر خود کو مجبور پاتے ہیں کہ ان الفاظ کے معانی مخصوص تاریخی تناظر میں ہی متعین کئے جائیں ایسا کرنے والے نہ صرف یہ کہ الفاظ اور ان کے معانی کو منجمد کر دیتے بلکہ وہ وحی کا مطالعہ تاریخ کی مدد سے کرنا چاہتے ہیں اور تاریخ اپنی تعریف کے اعتبار سے ایک ایسا ماخذ ہے جس پر پوری طرح انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ تاریخ کو وحی کی کلید قرار دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ آج وحی ربانی کی موجودگی کے باوجود ہم اس سے روشنی حاصل کرنے سے محروم ہیں اور یہی غلطی وہ لوگ کرتے ہیں جو وحی جیسے لازوال ماخذ کو Sociology یا Anthropology جیسے غیر نمو یافتہ علوم کے ذریعہ سے وحی کے مطالعہ کے داعی ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ روایتی علماء جو تاریخ کے حوالے سے قرآن کے مطالعہ کے خوگر ہیں اور جدید دانش ور جو جدید نمو پذیر سماجی علوم کے توسط سے قرآن کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں دونوں ہی کو اس بات پر اصرار ہے کہ تشریح وتعبیر کا حق انہیں ہی حاصل ہے۔

ہم جس دنیا میں سانس لے رہے ہیں اس میں ہر طرف ہر لمحہ زندگی کا سفر جاری ہے۔ کائنات ہر لمحہ اپنے آپ کو منکشف کر رہی ہے۔ اس حقیقت سے آنکھیں بند کر لینا اور تشریح وتعبیر کو محض طبقۂ خاص کا حق قرار دینا ایک بات ہے اور وثیقۂ وحی کو اپنے خاص سیاق میں از سر نو سمجھنے کا عزم کرنا بالکل دوسری بات۔ جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے تو یہ رویہ ماضی میں مذہب کے نام پر نظام جبر کے قیام کا سبب بنا ہے۔ رہی دوسری بات تو ہمارے عہد میں اپنی تمام تر علمی پونجی کو بروئے کار لاتے ہوئے تعبیر وحی کی از سر نو کوشش کا کام ابھی باقی ہے۔ مذہب کے نام پر جب بھی نظام جبر کے قیام کی کوشش ہوئی ہے اور جب بھی مذہب کے حوالے سے انسانی عقل پر پہرے بٹھانے کا غیر مستحسن کام کیا گیا ہے اس صورتحال نے ہمارے اجتماعی نظام کو تہہ وبالا کر دیا ہے۔ اہل یہود

کے یہاں معبد کی مذہبی زندگی جسے دراصل احبار کی حکومت کہنا چاہئے، دوبارا اپنے دردناک انجام کو پہونچی اور آج اہل یہود بھی یروشلم کی عظمت لوٹائے جانے کی راہ تک رہے ہیں۔ یہودی علماء نے خدا کے عظیم آفاقی پیغام کو اپنی بند دماغ تشریحی کوششوں سے ایک فرقہ وارانہ ثقافتی دین بناڈالا۔ جس میں نجات کا امکان صرف اہل یہود کے لئے باقی رہ گیا۔ کچھ یہی صورتحال عیسائی دنیا میں پیدا ہوئی جہاں حضرت مسیح کے حوالہ کے بغیر نجات کا ہر امکان سرے سے مسترد کر دیا گیا۔ چرچ کے قائدین حضرت مسیح کے حوالے سے نجات کے پروانے جاری کرنے لگے۔ صورتحال یہاں تک آپہونچی کہ حضرت مسیح کے زبانی نام لیواؤں کے علاوہ تمام اقوام عالم پر نجات کا دروازہ بند سمجھا گیا۔

کچھ یہی صورت حال عثمانی خلافت کے ساتھ پیش آئی جہاں اسلام کی آفاقی دعوت گم ہوگئی پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ محض اس کے نام سے سلطنت کا عظیم ڈھانچہ برقرار رہ پاتا۔ تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ جب بھی مذہبی گروہوں نے آفاقی پیغام سے منھ موڑ کر ایک فرقہ وارانہ شناخت کو اپنا شعار قرار دیا ہے اور جب بھی انہوں نے دنیوی کامیابی اور اخروی نجات پر دوسری اقوام کے لئے دروازے بند کئے ہیں انہوں نے اپنے آپ کو ایک ایسی صورتحال میں پایا ہے جہاں سے نکلنے کے تمام راستے معدوم ہوگئے ہوں۔ جب وحی کی تعبیر فرقہ وارانہ ذہنیت کی اسیر ہو جائے تو انسانوں کو ایسا لگتا ہے کہ خدا کی کتاب کے الفاظ منجمد ہوں جس نے کبھی ان کے پرکھوں سے کلام کیا تھا، وہی پرکھے جنہیں ہر مردہ قوم Pious Elders یا سلف صالح سے تعبیر کرتی اور ان کی اتباع کو خدا اور اس کے رسول کی اتباع سے زیادہ اہم سمجھتی ہے۔ جب وحی کے لازوال الفاظ، ایسا محسوس ہو کہ، انسانوں سے کلام نہیں کر رہے ہوں تو عام انسانوں کے لئے اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں رہ جاتا کہ وہ اپنے آپ کو سلف صالحین کی غیر مشروط اتباع میں دے دیں۔ اس غیر تخلیقی اور غیر صحت مندانہ رویہ سے جھوٹی دینداری وجود میں آتی ہے۔ انسانِ رسومِ دینداری کو غایت دین سمجھنے لگتا ہے۔ اور پھر مذہب کے نام سے مذہب کی نفی پر مبنی نظام جبر کا قیام عمل میں آجاتا ہے۔ خدا یہ چاہتا ہے کہ انسانوں کی گردنیں انسانوں کی تابع داری سے آزاد ہوں اور اسی لئے وہ بندوں کی طرف اپنے پیغامبر بھیجتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس جھوٹی دینداری کے امین مذہب کے نام پر احبار کا نظام جبر قائم کر دیتے ہیں۔ انسانی تاریخ میں خدا کے سچے پیغمبروں کو رسمی دینداری کے ہاتھوں جو اذیتیں اٹھانی پڑی ہیں اس کی کوئی نظیر کسی دوسرے طبقہ کی طرف سے کی جانے والی مخالفت میں نہیں ملتی۔

آج ہم جس عہد میں سانس لے رہے ہیں۔ اس کے بارے میں مغرب میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی جارہی ہیں ۔ مابعد تاریخ کے احساسات نے مغرب کو اپنی تاریخ کے سب سے بڑے بحران سے دوچار کر رکھا ہے۔ مغرب میں فلسفہ کے زوال نے اسے ایک لسانیاتی خوشہ چینی کا فن بنا دیا ہے۔ یہی حال مغربی جمہوریت کا ہے جو کسی نظام انصاف کے قیام میں ان ملکوں میں بھی ناکام رہی ہے جنہیں جمہوریت کا گڑھ سمجھا جاتا ہے۔ آج نہ صرف یہ کہ جدید سائنس اپنے تمام ابعاد کے ساتھ علماء و

مفکرین کے ہاں محل نظر ہے بلکہ مغرب میں مروجہ سماجی رویہ مثلاً اسقاط حمل، ہمزاد شادیاں اور رشتۂ ازدواج سے ماوراء جنسی تعلقات اب پھر سے موضوع بحث بن گئے ہیں۔ یہ وہ موضوعات تھے جن کے بارے میں کبھی سمجھا جاتا تھا کہ ان پر اب کسی گفتگو کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ جدید مغرب اپنی کشش کھو چکا ہے اب اس کے بطن سے کیا کچھ برآمد ہونے کو ہے اس بارے میں ابھی کچھ کہا جانا قبل از وقت ہے۔

گذشتہ چند دہائیوں میں بین المذاہب مکالموں اور اجتماعات کے لئے بڑا جوش وخروش دیکھا گیا ہے۔ مختلف مذاہب کے سعید نفوس اس مسلسل سمٹتی ہوئی دنیا میں خود کو علاحدہ رکھنے میں دشواری محسوس کرتے اور انہیں یہ بات مسلسل کچوکے لگاتی رہتی ہے کہ وہ اخروی نجات کے امکانات پر صرف اپنی اجارہ داری قائم رکھیں۔ لاطینی امریکہ کی لبریشن تھیولوجی، تائیوان کی ہوم لینڈ تھیولوجی، کوریا کی من یوئنگ تھیولوجی اور ہندوستان میں دلتوں کے حقوق انسانی کو تسلیم کرنے کے لئے کی جانے والی کوششیں، دراصل جدید دنیا کی باقیات ہیں جن کے خرابے سے ہمارے کانوں میں مسلسل ایک ایسی آواز آرہی ہے جسے مستقبل کا روحانی نغمہ کہا جاسکے۔ سمٹتی سکڑتی دنیا نے انسانوں کو از سرنو اپنی بازیافت پر مجبور کیا ہے۔ فرقہ وارانہ دینیات کے بجائے ایک عالمی دینیات کی تشکیل کے لئے فضا کافی سازگار ہوگئی ہے۔ اسلام کے اس آفاقی پیغام کی بازیافت کا وقت گویا اب آپہنچا ہے۔ مسلمان اگر اسلام کو مسلم قومی ورثہ کے بجائے رب العالمین کے لازوال پیغام کی حیثیت سے پیش کرسکیں تو وہ محسوس کرینگے کہ تمام اقوام عالم خدا کی نغمہ سرائی میں ان کے ساتھ شریک ہوگئی ہیں:

ساری تعریف اس اللہ کے لئے ہے جو سارے جہان کا پروردگار ہے
نہایت مہربان اور رحم کرنے والا ہے
روز جزاء کا مالک ہے۔
اے اللہ! ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد کے طلبگار ہیں
اے اللہ تو ہمیں سیدھے راستے کی رہنمائی فرما،
ان لوگوں کا راستہ جن کو تو نے انعام واکرام سے نوازا،
نہ کہ ان لوگوں کا جن پر تیرا غیظ وغضب نازل ہوا۔ (قرآن ۱ : ۱-۶)

قرآن نے فرعون جیسے بااختیار مرد اور ابولہب جیسے بدویانہ افتخار کے حامل شخص کے لیے تباہی کی وعید سنائی ہے جبکہ دوسری طرف ملکہ سبا جیسی حق شناس عورت کی قیادت میں پوری قومِ سبا کی راہ یابی کا مژدہ سنایا ہے۔ آج اگر مسلم معاشرہ میں عورتیں خود کو حاشیہ پر محسوس کرتے ہوئے پدرانہ مسلم معاشرہ میں اپنے سماجی رول کی از سرنو بازیافت کے لیے اپنے اندر امامت جیسے مسئلہ کو بزور بازو حاصل کر لینے کی ہمت پاتی ہیں تو اسے اس تاریخی تسلسل سے علاحدہ کوئی اجنبی عمل نہیں کہا جا سکتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے تہذیبی ورثے پر متحیر ہونے یا اجنبیت کی نگاہ ڈالنے کے بجائے اسے اس وسیع تناظر میں دیکھیں۔

عورت کی امامت

کیا کسی مسلم خاتون کے لیے اس بات کی گنجائش موجود ہے کہ وہ نماز جمعہ کی امامت کرے اور وہ بھی ایک ایسی صورتحال میں جب اس کے مقتدیوں میں عورتوں کے علاوہ مردوں کی بھی وافر تعداد موجود ہو؟۔ یہ وہ فقہی سوال ہے جس پر مسلم دنیا کے دارالافتاء اور مؤثر شخصیات مختلف انداز سے اپنی رائے دے رہے ہیں۔ شیخ یوسف القرضاوی نے ،جنہیں عالم اسلام میں ایک معتبر عالم دین کی حیثیت حاصل ہے، اس مسئلہ پر شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے اس عمل کو دین سے انحراف پر مبنی قرار دیا ہے۔ دوسری طرف شیخ الازہر اور اس قبیل کے دیگر علماء عورت کی امامت کو سرے سے قابل استرداد تو نہیں ٹھہراتے البتہ ان کے خیال میں عورت کی امامت صرف خاتون مقتدیوں تک محدود ہونی چاہیے۔ سعودی عرب اور خود ہندوستان میں روایتی علماء نے اس عمل کو باعثِ گناہ بتایا ہے۔ ان علماء کرام کو اس بات پر شدید غصہ ہے کہ ایک ایسی صورتحال میں جب امت اسلامیہ پر خارج سے شدید حملے ہورہے ہیں خود دختران امت فتنے کی اس نازک گھڑی میں اس قسم کے مباحث چھیڑ کر آخر کیا حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ انہیں اندیشہ ہے کہ اس طرح کی کوششوں سے بالآخر فائدہ دشمن کو ہی پہونچے گا اور اس طرح امت کا ذہنی خلفشار اور فکری انتشار عام لوگوں پر کہیں زیادہ نمایاں ہو جائے گا۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اس مسئلہ پر غم وغصہ کے بجائے ٹھنڈے دل و ماغ سے غور کیا جائے کہ یہی عقل کا تقاضا ہے اور قرآن کی تعلیم بھی۔ فقہی اعتبار سے اگر اس سوال پر غور کیا جائے کہ مسلمانوں کے کسی اجتماع میں امامت کا اہل کون ہے؟ تو خود فقہاء کے نزدیک یہ چیز دیکھی جائے گی کہ جو ان میں نسبتاً تقویٰ میں بڑھا ہوا ہو، دین کی فہم وبصیرت سے معمور ہو اور جسے قرآن مجید کی ترتیل کا بہتر سلیقہ حاصل ہو، وہاں سِرے سے یہ بحث نہیں آئے گی کہ ان اعلیٰ صلاحیتوں کا حامل شخص مرد ہو یا عورت کہ قرآن نے نسلی یا جنسی شناخت کو سرے سے لائق اعتناء نہیں سمجھا ہے۔ کسی ذات کا عورت ہونا اس کے لیے سماجی اور دینی طور پر وجہٴ معذوری بن جائے ،قرآنی دائرہ فکر سے اس خیال کی توثیق نہیں کی جاسکتی۔ یہ تو تھا عورت کی امامت پر قرآنی دائرہ فکر میں رہتے ہوئے غور کرنے کا معاملہ۔ رہی یہ بات کہ فقہا ان مسائل پر کس طرح سوچتے ہیں تو اس میں شبہ نہیں کہ ان کے یہاں صرف

اس خیال سے ایک مباح کام کو ممنوع قرار دینے کی روایت موجود ہے جس کی بنیاد صرف اس اندیشے پر رکھی گئی ہو مبادا یہ عمل فتنہ کا سبب بن جائے۔ مثال کے طور پر عورتوں کے مسجد میں داخلے کے مسئلہ کو لیجئے۔ اسلام کی متوارث تاریخ اور امت کا متوارث عمل اس بات پر شاہد ہے کہ مسجد جو اسلام کا بنیادی سماجی ادارہ ہے اس میں عورتوں کی شمولیت کا عہدِ رسول سے التزام کیا گیا ہے۔ حرم مکی اور مسجد نبوی میں یہ استمرار آج تک موجود ہے۔ گو کہ ماضی میں بعض حکام اور علماء نے مخلوط طواف پر روک لگانے کی کوششیں کیں لیکن ان کی یہ کوششیں بارآور نہ ہوسکیں۔ اس سلسلے میں عطا جیسے جلیل القدر محدث کی مزاحمت کا سلسلہ تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے۔ البتہ حجاز مقدس سے دور جہاں فقہا کی فہم پر مقامی اثرات کہیں زیادہ حاوی ہو گئے انہوں نے اس خیال سے عورت کے سماجی رول پر قدغن لگا دی مبادا معاشرے میں اس کی آزادانہ چلت پھرت اور مسجدوں میں اس کی آمد و رفت زوال زدہ مسلم معاشرہ کو مزید فتنہ میں مبتلا کر دے۔ حالانکہ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اگر مسلم مرد کی اخلاقی حالت قابل رحم تھی تو مرد کی اخلاقی تربیت کی جاتی۔ اس کے برعکس ہوا یہ کہ اس کی سزا عورتوں کو دی گئی اور انہیں مسجد جیسے مرکزی مقام سے انخلاء پر مجبور کر دیا گیا۔

بات یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ زوال کے پرآشوب دور میں اپنا دین بچائے رکھنے کے لیے اس بات کی بھی ضرورت محسوس کی گئی کہ مسلم خواتین سے قرآنی احکام حجاب کے علاوہ مزید اضافی پردے کا مطالبہ کیا جائے۔ چنانچہ چہرے اور ہتھیلیوں کے انکشاف کی جو روایت قرن اول سے چلی آرہی تھی اور جس کی تائید میں آج بھی تاریخ و احادیث کی کتابوں سے بے شمار دلیلیں لائی جاسکتی ہیں اسے کالعدم قرار دیا گیا۔ گو کہ علماء کے درمیان چہرے کے پردے کا مسئلہ آج تک متنازع ہے البتہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ چہرے کے پردے کو دین کی محتاط ترین تعبیر قرار دینے کے نتیجہ میں آج مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی اسے دین کی صحیح تعبیر سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ یہاں بھی دراصل احتیاط کا وہی مفروضہ اصول کارفرما ہے کہ اگر تمام جسم کو ڈھکنے کے بعد بھی چہرہ کھلا رہ گیا تو زوال زدہ معاشرہ میں فتنہ کا سد باب ممکن نہ ہوگا۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر بعض حلقوں میں اب یہ خیال عام ہے کہ غیر مردوں کے لیے عورت کی آواز کا سننا حرام ہے اور بعض مسلم سماج میں آج بھی خواتین کے نام کو منکشف یا متعارف کرانا اسلامی قدروں کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ احتیاط کے اس فلسفہ کا سب سے زیادہ خمیازہ مسلم خواتین کو بھگتنا پڑا کہ صدیوں پر مشتمل اس پورے احتیاطی عمل میں وہ بے چہرہ، بے نام اور بے آواز ہو کر رہ گئیں۔ ایک مسلمہ کی حیثیت سے انہیں اپنے سماجی اور دینی رول سے دست بردار ہونا پڑا۔ دوسری طرف جو لوگ مسلم معاشرہ کے زوال کو روکنے کے لیے اٹھے تھے ان کی ساری توجہ عورتوں کو قابو میں رکھنے میں صرف ہوگئی، مردوں کی خاطر خواہ اصلاح کا کام ان کے پروگرام سے محو ہوگیا۔ فی زمانہ جو لوگ عورت کی سماجی، سیاسی یا مذہبی قیادت کو صرف اس بنیاد پر رد کرنا چاہتے ہیں کہ ایسا کرنا ایک نئے فتنہ کا موجب ہوسکتا ہے وہ دراصل قدماء کی اسی روش پر گامزن ہیں جس کے نتیجے میں ہمارے جاری زوال کی رفتار میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔

اسلام نام ہے خودسپردگی کا۔ یہ خودسپردگی مردوں سے بھی اسی قدر مطلوب ہے جتنی عورتوں سے۔ ہمیں یہ بات تسلیم کرنے میں ذرہ برابر تامل نہیں ہونا چاہیے کہ خدااوراس کا رسول اس بات کو کہیں بہتر سمجھتا ہے کہ کون سی چیز باعث فتنہ ہے اور کس عمل سے انسانی معاشرہ کا توازن برقرار رہ سکتا ہے۔ اگر اللہ نے مسلم خاتون کو مسلم مرد کی طرح مسجد کی دینی وسماجی زندگی میں شرکت کا حق دیا ہے اوراگر اسے رسول اللہ نے اپنے عہد میں عمل کی سند بخشی ہے تو ہمیں یہ حق نہیں پہونچتا کہ ہم بعد کے عہد میں اپنے ناقص فہم کی بنیاد پر عورتوں سے ان کا یہ حق چھین لیں۔ تاریخِ اسلام کا معمولی طالب علم بھی اس بات سے واقف ہے کہ عہد رسول کی سماجی زندگی میں عورتوں کی چلت پھرت، ان کے ناموں اور چہروں کا معروف ہونا، تجارت اور حرفت میں ان کی شرکت، معمول کی بات تھی۔ خلفائے راشدہ کے عہد میں سیاسی امور پر ان سے مشاورت طلب کی جاتی اور ایک غیر معروف چپٹی ناک والی عورت عمرؓ جیسے صاحب الرائے خلیفہ کو عین خطبہ میں ان کی تعبیری لغزشوں پر برملا متنبہ کرنا اپنا فرض جانتی۔ اسلام کی اس ابتدائی معاشرت کو اگر متصور کیجئے تو اکیسویں صدی کی ابتدا میں کسی مسلم خاتون کے نماز جمعہ پڑھانے کی بات کوئی قابلِ حیرت واقعہ نہیں معلوم ہوتا۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ نے خطبات بہاول پور میں قرن اول سے ایسے دو واقعات کا ذکر کیا ہے جس میں عورت کی امامت کا تذکرہ ملتا ہے، اگر یہ تاریخی واقعات کتابوں میں موجود نہ ہوتے جب بھی ہمیں یہ سمجھنے میں زیادہ دشواری نہیں ہونی چاہیے تھی کہ اسلام نے تقویٰ کے جس بنیادی جوہر کو بارگاہ الٰہی میں قبولیت کی شرط قرار دیا ہے اور جو مرد و عورت دونوں کے لئے یکساں جوہرِ امتیاز ہے، اس کے بعد اس بات کی گنجائش ہی کہاں رہ جاتی ہے کہ کوئی شخص صرف اس بات پر فخر کرے کہ وہ کسی خاص نسل، خطے، رنگ ونسل یا جنس کا حامل ہے۔ قرآن نے اس بات کی وضاحت کردی ہے کہ کسی شخص کا عمل صرف اس لئے ساقط الاعتبار نہیں ہوسکتا کہ وہ وہبی طور پر کسی خاص گروہ یا جنس میں پیدا ہوا ہے۔ ﴿انی لا اضیع عمل عامل منکم من ذکر أو انثی بعضکم من بعض﴾ (آل عمران: ۱۹۵) جہاں اس بات کی ضمانت دی جارہی ہو کہ کسی کا ذرہ برابر بھی عمل رائیگاں نہ جائے گا ﴿و لا تکسب کل نفس الا علیھا و لا تزر وازرۃ وزر اخری﴾ (الانعام: ۱٦٤) اور یہ کہ ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ ملے گا (کل نفس بما کسبت رھینۃ) جہاں تمام شناختیں جھوٹی قرار پاتی ہوں، مرد اور عورت سبھوں کے لیے صبغۃ اللہ کو اختیار کرنے کی تلقین ہو وہاں اس کا سوال ہی کب پیدا ہوتا ہے کہ کوئی شخص محض اپنی مردانہ وجاہت کو متبع مؤمن عورتوں پر تفوق کے لئے پیش کرسکے۔ قرآن نے فرعون جیسے بااختیار مرد اور ابولہب جیسے بدویانہ افتخار کے حامل شخص کے لیے تباہی کی وعید سنائی ہے جبکہ دوسری طرف ملکہ سبا جیسی حق شناس عورت کی قیادت میں پوری قومِ سبا کی راہ یابی کا مژدہ سنایا ہے۔ گویا مرد و عورت، سیاہ وسفید، نسل ووطن ہر وہ چیز جو انسان کی وہبی میراث ہو اس کو کالعدم قرار دیتے ہوئے اس بات کو واضح کردیا گیا ہے کہ خدا کے نزدیک جو چیز قابل ستائش ہے وہ محض عمل صالح ہے اور یہ ایک ایسی چیز ہے جس کے بارے میں مسلمان تو مسلمان اہل اسلام کے علاوہ بھی

دوسری قوموں کے صالحین سے بے انصافی نہیں کی جائے گی۔ ان کا اجر ضائع نہیں ہوگا۔ ایک ایسی کتاب کے ماننے والے جس کے بیّنات جا بجا اس بات کی صراحت کر رہے ہوں کہ رنگ و نسل، جنس و جغرافیہ، شمال و جنوب، عرب و عجم کے تمام غیر فطری امتیازات مٹا دئے گئے ہیں جس کی جھولی میں عمل صالح ہے وہ فیصلہ کے اس دن کا انتظار کرے جب خود بار الٰہا کھڑے کھوٹے میں فیصلہ کر دے گا۔ اس سے پہلے کسی ذمہ دار اور خدا شناس اہل ایمان کو اس بات کی ہمت کیسے ہوسکتی ہے کہ وہ کسی کو گنہگار یا واصل جہنم بتائے کہ ان بڑے امور کا فیصلہ تو خدا نے اس دن کے لئے محفوظ کر رکھا ہے۔

﴿بأي ذنب قتلت﴾ سے دینی اور سیاسی رہنمائی تک عورت نے ایک طویل سفر طے کیا ہے۔ محمد رسول اللہ نے اکرامِ آدمیت کی جس تحریک کا آغاز کیا تھا دنیا کے مختلف گوشوں میں اس کے دوررس اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ صرف امتِ مسلمہ اس نبوی تحریک کی برکات سے فیضیاب نہیں ہوئی بلکہ معاشرے کے دوسرے دبے کچلے لوگوں کو بھی اس کا وافر فائدہ پہنچا۔ سود کی دلدل میں پشتہا پشت سے پھنسے خاندانوں نے راحت کی سانس لی، غلامی کا ادارہ رفتہ رفتہ اس سرزمین سے غائب ہوگیا۔ اسی طرح عورتوں کو مردوں کا دست نگر بنائے رکھنے کی جاہلی روایت کا خاتمہ ہوا۔ ﴿والمؤمنون والمؤمنات بعضهم اولياء بعض﴾ (التوبة:٦٧) کے نشاط انگیز پیغام نے اس خیال کی جوت جگائی کہ اب انسانی معاشرے کو سپردگی کی راہوں پر لے چلنے میں عورت اور مرد کا برابر کا رول ہوگا۔

عہدِ رسول میں جس انقلاب کی بناء رکھی گئی تھی اس کے تمام ثمرات اس عہد میں حاصل نہیں ہوگئے تھے کہ اگر ایسا ہوگیا ہوتا تو آگے کی تاریخ اور آخری رسول کی معنویت کیا رہ جاتی؟ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عہدِ رسول میں جو ثمرات حاصل نہیں ہوئے اسے آئندہ بھی نہیں ہونا چاہیے یا جو لوگ اس بات پر مصر ہیں کہ جو کام عہدِ رسول میں نہ ہوا ہو اسے آنے والی صدیوں میں انجام دینا قربِ قیامت کی علامت کا ظہور ہے وہ دراصل آخری رسول کی معنویت اور قرآن کی ابدیت کا صحیح ادراک نہیں رکھتے۔ ورنہ ان کے پاس آخر اس سوال کا کیا جواب ہے کہ قرآن میں غلاموں سے حسنِ سلوک کے جو آداب بتائے گئے ہیں ان کا فی زمانہ اس لئے انطباق نہیں ہوسکتا کہ اب غلامی کا قدیم ادارہ باقی نہیں رہا۔ ہم اس واضح اور روشن حقیقت کا کیسے انکار کر سکتے ہیں کہ قرآن میں غلاموں سے حسنِ سلوک یا ان کو آزاد کرنے کی ترغیب کے نتیجہ میں لامحالہ ایک نہ ایک دن اس ادارہ کا خاتمہ یقینی تھا۔ گویا یہ ترغیب و احکام ایک بڑے سماجی انقلاب کی ابتدا تھی، انتہا نہیں۔ ان کے واقعی اثرات تو آنے والی صدیوں میں ہی مجسم ہونے تھے۔ اسی طرح قرآن میں احکام زکوٰۃ کو پڑھ کر کوئی شخص اس نتیجہ پر نہیں پہونچتا کہ قرآن غرباء کا ایک طبقہ باقی رکھنا چاہتا ہے تا کہ امراء اپنی دینی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ان کی طرف ملتفت ہوں۔ کچھ یہی حال مسلم معاشرہ میں عورت کے ارتقائی سفر کا ہے۔ عہدِ رسول میں عورت کو مرد کے بالمقابل جس طرح ایک مساوی شخصیت کے طور پر تسلیم کیا گیا اور جس طرح

سماجی سرگرمیوں کے دروازے اس پر کھولے گئے اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ آنے والی صدیوں میں علم وتقویٰ کی بنیاد پر عورتیں سماجی زندگی کے اعزاز واکرام پر اپنا دعویٰ قائم کریں۔ اسلام نے عورتوں کے امپاورمنٹ کی جو بنیاد رکھی تھی اس کے وسیع اور دوررس اثرات مسلم معاشرہ سے باہر بھی پڑتے رہے ہیں۔ مغرب میں آزادی نسواں کی تحریکیں، سماجی اور سیاسی انصرام میں ان کی شمولیت، رائے دہی کا حق، انفرادی آزادی کی ضمانتیں یہ سب اچانک خلا سے وجود میں نہیں آگئی ہیں۔ ان کے پیچھے بھی دراصل اسی نبوی تحریک کے اثرات ہیں جو صدیوں کے ثقافتی تعامل کے نتیجے میں مغربی اقوام تک پہنچی ہیں اور جہاں وحی سے بے نیازی کی وجہ سے شخصی آزادی کی تحریکیں آج افراط وتفریط کا شکار ہیں۔

انسانی معاشرہ مسلسل نمو پذیر ہے۔ آپؐ نے مکہ میں اکرام آدمیت کی جس تحریک کا آغاز کیا تھا اس کا سلسلہ روکے نہیں رک سکتا۔ انسانیت کے سفر میں جن لوگوں کی نگاہیں میگنا کارٹر سے آگے نہیں دیکھ پاتیں یا جو یہ سمجھتے ہیں کہ یونیورسل ڈیکلریشن آف ہیومن رائٹس سے پہلے انسانی تاریخ کا سفر منجمد تھا وہ دراصل دانستاً تاریخ سے ناواقفیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ آج دنیا میں اکرام آدمیت کی جتنی باتیں ہورہی ہیں یا دنیا کو تباہی سے بچانے، نیوکلیئر جہنم سے محفوظ رکھنے، ماحولیات کی فکر گیری، انسانوں سے بڑھ کر جانوروں بلکہ دوسری مخلوق کے انقطاع نسلی کے اندیشے، ہواؤں کی تطہیر کے منصوبے اور سمندروں کی فطری آب وتاب کو برقرار رکھنے کی کوششیں، ان سبھوں کے تانے بانے اسی نبوی تحریک سے ملتے ہیں۔ آج اگر مسلم معاشرہ میں عورتیں خود کو حاشیہ پر محسوس کرتے ہوئے پدرانہ مسلم معاشرہ میں اپنے سماجی رول کی ازسرنو بازیافت کے لیے اپنے اندر امامت جیسے مسئلہ کو بزور بازو حاصل کر لینے کی ہمت پاتی ہیں تو اسے اس تاریخی تسلسل سے علاحدہ کوئی اجنبی عمل نہیں کہا جاسکتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے تہذیبی ورثے پر متحیر ہونے یا اجنبیت کی نگاہ ڈالنے کے بجائے اسے اس وسیع تناظر میں دیکھیں۔ کسی انسانی عمل میں خواہ وہ ﴿فاستبقوا الخیرات﴾ کی تحریک ہی کیوں نہ ہو افراط وتفریط کا پیدا ہو جانا عبث نہیں کہ اس افراط وتفریط کی اصلاح کی گنجائش تو ہر لمحہ رہے گی۔ البتہ اگر ہم نے ان اقدامات کو صرف یہ کہہ کر رد کر دیا کہ یہ دشمن کی سازش یا دین سے باغی مسلمانوں کا مردود عمل ہے تو ہم صورتحال کی صحیح تفہیم تک پہنچ سکیں گے اور نہ ہی ممکنہ اصلاح کا کوئی امکان باقی رہ جائے گا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اسلام کی چودہ صدیوں میں چند استثنائی تاریخی واقعات کو چھوڑ کر عورت کو مسجد کے منبر پر بحیثیت امام یا خطیب قبول کر لینے کی سماجی روایت مستحکم نہیں ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس بات سے انکار بھی ممکن نہیں کہ عورت کو فقیہہ، مدبرہ اور معلّمہ کی حیثیت سے تسلیم کرنے میں مسلم مردوں نے کم ہی تکلف یا بخل کا مظاہرہ کیا ہے۔ البتہ اگر ہم اس اصول کو اپنے سامنے رکھیں کہ اسلامی تحریک کے اثرات، سب کے سب، عہد رسول میں ظاہر نہیں ہوگئے تھے بلکہ اس کے اثرات مستقبل میں بھی ظاہر ہوتے رہیں گے اور یہ کہ عالمی سطح پر ایک نبوی معاشرہ کے قیام کا منصوبہ ابھی شرمندۂ تعبیر ہونا باقی ہے اور یہی آخری رسولؐ کی معنویت اور

ان کے متبعین کے لیے جواز بقا ہے، تو پھر ہمارے غور وفکر کا انداز یکسر بدل جائے گا۔ ہم عورت کی امامت کے مسئلہ کو محض ایک فتنہ یا قرب قیامت کی علامت بتانے کے بجائے اس پر قرآنی محاکے کی ضرورت محسوس کریں گے۔ ہمارے خیال میں جو لوگ اس واقعہ کو غارت گرِ ایمانی کا سبب بتاتے ہیں وہ دراصل اپنے اندر قرآنی دائرہ فکر میں محاکے کی ہمت نہیں پاتے یا اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ ان کے لیے قدماء کی تعبیر اور ان کے فتاویٰ سب کچھ ہیں حتی کہ وہ ان تعبیرات پر محاکے کو بھی فتنہ سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بات اصولی طور پر درست نہیں کہ مستقبل کے دین کو اور اس دین کو جو آخری لمحہ تک ہماری رہنمائی کا دعویدار ہے اسے قدماء کی تعبیر کا تابع کر دیا جائے کہ ایسا کرنا وحی کو اس کے فریضہ سے معطل کر دینا ہے۔ بدقسمتی سے مسلم معاشرہ میں صدیوں سے قرآن کو محور غور وفکر سے پَرے محض کتاب برکت کی حیثیت سے دیکھنے کا رواج عام ہے۔ ہم اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ قدما بھی ہماری طرح انسان تھے۔ وحی کی تشریح و تعبیر، احکام کے استخراج و استنباط اور حکمت و مصالح کے تعین میں ان سے بھی غلطیوں کا صدور ہوا ہوگا۔ ہم اس بات کے سزاوار نہیں کہ ان کے التباس فکری کو اپنے کمزور کاندھوں پر ڈھوتے پھریں۔ ہمارے لئے ہماری اپنی فکری اور عملی لغزشیں ہی کیا کم ہیں کہ ہم قدما کی لغزشوں کا بوجھ بھی اٹھانا ضروری خیال کریں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس نازک، حساس اور اہم مسئلہ پر قدیم فقہی ڈھانچے میں اظہار غیظ وغضب کے بجائے اس کا محاکمہ چودہ صدیوں پر محیط نبوی تحریک کے ارتقائی سفر کی روشنی میں کیا جائے۔ البتہ اس عمل میں نئے مجتہدین کے لئے لازم ہوگا کہ جس طرح وہ قدیم فقہ پر سماجی اور سیاسی اثرات کے شاکی ہیں اسی طرح مسئلے کی تحکیم میں عہد جدید کے سماجی و سیاسی مضمرات سے بھی حتی الامکان اپنا دامن بچائے رکھیں۔

قرن اول میں قرآن مجید مسلمانوں کے درمیان آخری فیصلہ کرنے والی کتاب تھی جس کے آگے عامی اور دانشور علماء اور عوام سب اپنا سر تسلیم خم کرتے تھے، یہ بات تسلیم کی جاتی تھی کہ خلیفہ وقت کی قرآن فہمی پر ایک بدوی عورت سوالیہ نشان لگا سکتی ہے، مسلم معاشرہ میں بدوی عورت کا یہ علامتی کردار جب تک زندہ رہا عورت کے سماجی رول یا اس کے حقوق پر مصالح امت کے نام سے روک لگایا جانا ممکن نہ ہوا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم خواتین قرآن کے تازہ بہ تازہ مطالعہ کی اس روایت کو زندہ کریں جس کے زیر اثر ایک اعرابیہ حضرت عمر کی قرآن فہمی پر سوالیہ نشان لگا سکتی ہے، کہ جب تک مسلم معاشرے سے چپٹی ناک والی عورت غائب رہے گی نہ تو عورتوں کو ان کا گم شدہ سماجی رول واپس مل سکتا ہے اور نہ ہی مسلم معاشرے کو اس کی نصف مفلوج شدہ توانائی واپس مل سکتی ہے۔

کہاں گئی وہ چپٹی ناک والی عورت؟

مسلم معاشرے میں عورت ہنوز ایک مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ اہل تقویٰ کو اندیشہ ہے کہ اگر اسے ذراسی ڈھیل دی گئی یا اجتماعی زندگی میں اسے داخل ہونے کا موقع دیا گیا تو پھر فتنے کے نئے نئے دروازے کھل جائیں گے، اخلاقیات کی حدیں پامال ہو جائیں گی اور پھر نہ جانے کیا کیا کچھ ہوگا جس کا صحیح تصور تو یقیناً اہل تقویٰ کی بصیرت افروز آنکھیں ہی کر سکتی ہیں، البتہ اس عہد میں جب اسلام اور مسلمانوں پر بدترین شکست اور ذلت کا عذاب طاری ہے اور اس صورت حال سے بظاہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں دکھتا، تاریخ کے اس نازک موڑ پر مضطرب فکر منداور ذی فہم مسلم خواتین سوالی ہیں کہ صدیوں کی مردانہ قیادت نے مسلم معاشرے کو اگر زوال کی اس صورت حال سے دوچار کر دیا ہے تو آخر کب تک محض فتنے کے خوف سے وہ خود کو عضو معطل بنائے رکھیں اور یہ کہ کیا ایسا کرنا اسلام اور مسلمانوں کے مفاد سے پہلو تہی اور مجرمانہ تساہل نہیں قرار پائے گا، یہ وہ سوال ہے جو اب ان روایتی معاشروں میں بھی پوری شدت کے ساتھ سر اٹھا رہا ہے جہاں اب سے چند سال پہلے تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ عورت کو سماجی منظرنامے سے بے دخل کرنے کے باوجود اسلامی زندگی کی بساط اسی تزک و احتشام کے ساتھ سجائی جا سکتی ہے جو قرنِ اول کے مسلم معاشرے کا خاصہ ہوا کرتی تھی، لیکن اب ان روایتی معاشروں میں یہ احساس عام ہوتا جا رہا ہے کہ بدوی ثقافت اور سماجی رسوم میں یہ قوت نہیں کہ وہ اسلام جیسے انقلاب انگیز تصور زندگی کا متبادل بن سکے۔

سعودی عرب جہاں وہابی علماء نے کتاب وسنت سے کہیں زیادہ سماجی مصالح کے پیش نظر عورت کو سماجی رول سے بے دخل کرنے، اسے مکمل ملفوف کرنے حتیٰ کہ اس کے نام اور شناخت کو پوشیدہ رکھنے میں ہی عافیت جانی تھی وہاں کتاب وسنت کا علم رکھنے والی ذی شعور مسلم خواتین اس سوال کو پوری شدت سے اٹھا رہی ہیں کہ آخر کب تک عورتوں کو نئی مسلم تحریک میں بھرپور شمولیت اور سماجی منظرنامے میں شرکت سے روکا جاتا رہے گا، سعودی پریس میں یہ سوال بھی اٹھایا جاتا رہا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے عورت کو ایک الگ شناخت کے ساتھ پیدا کیا ہے تو کتاب وسنت کے علمبردار علماء اسے علیحدہ مسلم شخصیت کی حیثیت سے قبول کرنے کے بجائے اسے عزیز واقارب یا محرم مردوں کے فقط حاشیہ بنے رہنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ آخر علماء کے پاس اس بات کے لئے کیا دلیل ہے کہ وہ عورتوں کو سیاسی اور سماجی رول سے محروم کر دیں۔

مسلم معاشرے کی موجودہ تصویر جہاں عورت کو دین کے حوالے سے بعض لوگ گھروں میں محبوس کر دینا چاہتے ہیں یا بغیر کسی ثابت شدہ جرم کے عورتوں کو ان کے گھروں میں عمر قید کی سزا دینے کے طالب ہیں انہیں یہ جاننا چاہئے کہ ہماری یہ خودساختہ دینی تصویر قرآن مجید کی اس دعوتِ انقلاب کے یکسر برعکس ہے جس میں مرد وعورت کو اس کی علیحدہ شناخت کے ساتھ برابر کا رکن تسلیم کیا گیا ہے۔﴿والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض﴾ (التوبة:٦٧) یعنی اہل ایمان مرد وعورت نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں، ایسا نہیں ہے کہ مرد تو تقویٰ کی فضا عام کرتے ہوں اور عورتیں فحاشی اور بے حیائی کے ذریعے معاشرے کو تباہ کرنے پر تلی بیٹھی ہوں، عورت کے بارے میں اس طرح کے متعصّبانہ خیالات اسلامی ثقافت کی نہیں بلکہ راہبانہ مسیحی اور بودھ ثقافت کی پیداوار ہیں۔ اہل کلیسا مدت تک اس بارے میں بحث کرتے رہے کہ عورت کو روح ہوتی بھی ہے یا نہیں کیوں کہ ان کے یہاں آدم کی لغزشوں کا بنیادی محرک حوا کو قرار دینے کا خیال عام تھا۔ اور اسی مسیحی تصور حیات میں یہ بات بھی عام طور پر تسلیم کی جاتی تھی کہ عورت مرد کی پسلی سے پیدا کی گئی ہے پھر اسے علیحدہ مکمل وجود کی حیثیت سے کیسے تسلیم کیا جاسکتا تھا، اس کے برعکس قرآن عورت اور مرد کو شخصیت کی ایک ہی سطح پر مکمل علیحدہ وجود کے طور پر تسلیم کرتا ہے ﴿خلقكم من نفس واحدة﴾ مرد ہو یا عورت دونوں نہ صرف یہ کہ یہاں اپنے اپنے عمل کے لئے علیحدہ علیحدہ ذمہ دار ہیں بلکہ دونوں اس صلاحیت سے بھی متصف ہیں کہ وہ تقویٰ کے راستے پر ایک دوسرے سے آگے نکل جائیں، کسی کا محض مرد یا عورت ہونا اس کی تقویٰ شعاری میں مخل نہیں ہوسکتا ﴿ان أكرمكم عند الله أتقاكم﴾۔ دل اگر مسیحائی کا متلاشی ہو تو عورت ہوکر بھی ملکہ سبا نہ صرف اپنے لئے بلکہ اپنے تمام اہالیان ملک کے لئے بندگئ رب کا وسیلہ بن جاتی ہے، اس کے برعکس فرعون ونمرود کا مرد ہونا بھی اسے کفر کی ذلت ورسوائی سے نہیں بچا سکتا۔

مسلم معاشرے میں عورت کے حاشیہ پر آجانے یا اسے غیر قرآنی اور غیر اسلامی پردے کے نام پر سماجی زندگی سے بے دخل کر دینے سے نہ صرف یہ کہ مسلم معاشرے کی آدھی قوت معطل ہوگئی بلکہ جن اہل ایمان مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کا باہم رفیق ہونا چاہیئے وہ ایک دوسرے کے متحارب ہوگئے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے برسرِ منبر سماجی مصالح کے پیش نظر یہ فیصلہ لینا چاہا کہ مہر کی رقم اتنی کردی جائے جسے عام آدمی بآسانی ادا کرسکے تو ان کے اس فیصلہ کو ایک اعرابی عورت نے چیلنج کردیا، وہ کوئی معروف صاحب علم عورت نہیں تھی تاریخ کی کتابوں میں صرف یہ لکھا ہے کہ وہ ایک چپٹی ناک والی عورت تھی، اس کا کہنا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے خود قرآن میں مہر کے حوالے سے قنطار من الفضۃ والذھب کا تذکرہ کیا ہے تو اے عمرؓ تمہیں اس بات کا حق کہاں سے حاصل ہوگیا کہ تم اس حق سے عورتوں کو محروم کردو جسے اللہ نے ہمارے لئے روا رکھا ہے، کہا جاتا ہے کہ اس قرآنی دلیل کے آگے حضرت عمرؓ نے اپنے سوچے سمجھے فیصلے کو فی الفور واپس لے لیا اور اس بات کا برسرِ مجلس اعتراف بھی کیا کہ عمر سے غلطی ہوئی

جبکہ ایک عورت بات کو پا گئی، قرن اول میں قرآن مجید مسلمانوں کے درمیان آخری فیصلہ کرنے والی کتاب تھی جس کے آگے عامی اور دانشور علماء اور عوام سب اپنا سر تسلیم خم کرتے تھے، یہ بات تسلیم کی جاتی تھی کہ خلیفہ وقت کی قرآن فہمی پر ایک بدوی عورت سوالیہ نشان لگا سکتی ہے، مسلم معاشرہ میں بدوی عورت کا یہ علامتی کردار جب تک زندہ رہا عورت کے سماجی رول یا اس کے حقوق پر مصالح امت کے نام سے روک لگایا جانا ممکن نہ ہوا۔ قرن اول کے مسلم معاشرے میں حضرت عائشہؓ کی ذات ایک عالمہ اور مفکرہ کی حیثیت سے تو خیر جہاں خصوصی امتیاز کی حامل تھی وہیں مدینہ میں ایسی صاحب رائے مسلم خواتین بھی موجود تھیں جن سے حضرت عمرؓ نے خلیفہ ثالث کے انتخاب کے لئے پینل بناتے وقت مشورہ طلب کرنا ضروری جانا۔ پھر آج اگر کچھ لوگ دین کے حوالے سے عورتوں کو الکشن کے عمل سے دور رکھنے، ان کی نمائندگی یا حق رائے دہندگی کے سلسلہ میں شبہات کے شکار ہوں تو ان کے بارے میں اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہماری تاریخ اور اس قرآنی ثقافت سے نا آشنا ہیں جن کے سطحی حوالوں کے بغیر ان کی کوئی گفتگو مکمل نہیں ہوتی، علماء سے اپنی حق تلفی کی شکایت کے بجائے ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم خواتین قرآن کے تازہ بہ تازہ مطالعہ کی اس روایت کو زندہ کریں جس کے زیر اثر ایک اعرابیہ حضرت عمر کی قرآن فہمی پر سوالیہ نشان لگا سکتی ہے، کہ جب تک مسلم معاشرے سے چپٹی ناک والی عورت غائب رہے گی نہ تو عورتوں کو ان کا گم شدہ سماجی رول واپس مل سکتا ہے اور نہ ہی مسلم معاشرے کو اس کی نصف مفلوج شدہ توانائی واپس مل سکتی ہے۔

نہ تو اسرائیل کے حکمرانوں کو مذہب یہود سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی فلسطینی اتھارٹی کے پیش نظر ارض فلسطین میں کسی عادلانہ معاشرے کا قیام ہے، لیکن دونوں طرف جو لوگ جانیں دے رہے ہیں وہ خالص مذہبی جذبے سے سرشار ہیں۔ جو صدق دل سے یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی شہادت ایک مذہبی فریضہ ہے۔ کیا حکومتِ اسرائیل اور فلسطینی اتھارٹی کو برقرار رکھنے کے لئے یا مستقبل کی دو علیحدہ علیحدہ غیر توراتی اور غیر قرآنی ریاستوں کے قیام کے لئے دونوں طرف سے انسانی جانوں کے اتنے بڑے نذرانے کا کوئی جواز ہے؟

مسئلہ فلسطین: حق کے دو بول

عرصے سے ارض فلسطین ایک منصفانہ حل کا طلب گار ہے۔ اب تک دونوں جانب سے مسئلہ کا حل دریافت کرنے کی جو کوشش ہوئی ہے اس کے نتائج انتہائی حوصلہ شکن ہیں۔ انسانی جانوں کا اتلاف بڑھتا جارہا ہے۔ ایک طرف جدید ٹکنالوجی سے لیس حکومت اسرائیل ہے تو دوسری طرف مزاحمت کے لئے اٹھنے والی مختلف چھوٹی بڑی بے بس تنظیمیں۔ جن کے پاس انسانی جانوں کے علاوہ کوئی اور ہتھیار نہیں۔ گذشتہ پچاس برسوں میں دونوں طرف ایک دوسرے کے خلاف منافرت کا جذبۂ حرارت اتنا تیز ہوتا گیا ہے کہ اب اس ماحول میں عقل وانصاف کی ہر باتیں تحلیل ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ ایسی صورت میں دونوں طرف، کہیں کم اور کہیں زیادہ انسانی لاشوں کے ڈھیر لگتے جارہے ہیں۔ حیرت اس بات پر ہے کہ یہ معرکہ آرائی دو ایسی قوموں کے درمیان برپا ہے جو خیر سے خود کو الہٰ واحد کا تابعدار گردانتی ہیں اور دونوں اپنی اس مذہبی جنگ کا جواز رب ابراہیم کی بندگی اور انبیاء کے مقدسات میں ڈھونڈتی ہیں۔ دونوں قوموں کے مذہبی اور سیاسی قائدین نے مسئلہ کو حق و باطل کا رنگ دے رکھا ہے۔ دونوں کے نزدیک ارض فلسطین کے ایک انچ پر بھی سودا نہیں ہوسکتا۔ نہ ہی کسی قسم کی مصالحت جائز ہے۔ ایسی صورت میں مسئلہ کا منطقی حل تو یہی ہے کہ جس فریق کے پاس زیادہ قوت ہو وہ بزور بازو اس مسئلہ کو اپنے حق میں فیصل کرلے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ آج کی دنیا میں جہاں ریاست کو ٹکنالوجی کی غیر معمولی قوت حاصل ہوگئی ہے وہیں دوسری طرف گوریلا طرز کی دہشت بخش مزاحمت کمزوروں اور بے بسوں کے ہاتھوں میں ایک ایسے ناقابل شکن ہتھیار کے طور پر آگئی ہے جسے کسی ریاست کے لئے حتمی طور پر ختم کرڈالنا ممکن نہیں۔ اسرائیلی جانتے ہیں کہ ریاست کی تمام تر فوجی قوت کے باوجود فلسطینیوں کو صفحۂ ہستی سے ختم نہیں کیا جاسکتا اور فلسطینی بھی اس بات سے خوب واقف ہیں کہ ان خودکش دھماکوں سے ریاست اسرائیل کی اینٹ سے اینٹ بجادینا ممکن نہیں۔ لیکن دونوں فریق اپنی خودساختہ تقدیسی تاریخ کے الجھاوے میں کچھ اس طرح پھنس کر رہ گئے ہیں کہ اب وہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ دونوں ہی ایک طویل، ہلا مارنے والی، اعصاب شکن جنگ سے تھک چکے ہیں لیکن اپنی غیرت قومی کے سبب دونوں میں سے کوئی بھی اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں۔

تاریخ کے ایسے مرحلے میں جب تورات کے دعویدار اور قرآن کے حاملین ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوں اور دونوں کو یہ دعویٰ ہو کہ ارض مقدس کے حقیقی وارث صرف وہی ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ دونوں طرف کے اہل تقویٰ جن کے دل خشیت الٰہی سے مامور ہوں، جو قومی اور سیاسی مفاد سے اوپر اٹھ کر محض رضائے الٰہی کے لئے کچھ سوچنے اور کرنے کا داعیہ رکھتے ہوں وہ آگے آئیں اور انسانی جانوں کے اتلاف کے اس طویل سلسلے پر اپنی اپنی مذہبی تعلیمات کی روشنی میں باہمی گفت وشنید کے لئے اساس فراہم کریں۔

جب سے ریاست اسرائیل قائم ہوئی ہے۔ یہودی علماء کی ایک بڑی تعداد اس کے قیام کو غیر توراتی بتاتی رہی ہے۔ ان کے یہاں مسیح کی آمد سے پہلے کسی ریاست کے قیام کا کوئی جواز نہیں ہے۔ ان کے ہاں ایسے مفکرین کی بھی کمی نہیں جو بڑی جرأت کے ساتھ اسرائیل کو ایک ایسی یہود دشمن حکومت بتاتے رہے ہیں جہاں تورات کی تعلیمات کی کھلے عام نفی کی جاتی ہے۔ فلسطینیوں پر ہونے والے مظالم کی جتنی شدت سے مخالفت خود یہودی علماء ومفکرین کے حلقے سے ہوتی رہی اتنی شاید باہر سے بھی نہیں ہوئی ہوگی۔ اہل یہود کے ان خداترس علماء کی تحریروں کو پڑھئے اور قوم یہود میں ریاست اسرائیل کے مظالم کے خلاف جاری مختلف تحریکوں پر نظر ڈالئے تو یہ بات صاف محسوس ہوتی ہے کہ آج بھی ان کے یہاں ان شب بیدار اہل تقویٰ کی کمی نہیں، جن کی قرآن میں ستائش کی گئی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کے حلقے سے بھی موجودہ دل گرفتہ صورت حال پر قومی نقطۂ نظر کے بجائے قرآنی موقف اور ممکنہ قرآنی حل کو واشگاف انداز میں پیش کیا جائے۔

اس میں شبہ نہیں کہ قومی نقطۂ نظر سے ہمارا کیس خاصہ مضبوط ہے ہم وہ لوگ ہیں جن پر بزور بازو ایک ریاست تھوپی گئی اور ایک لامتناہی جنگ مسلط کردی گئی۔ پھر اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ فلسطین کا پرامن حل اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ غاصب یہودی واپس جائیں اور اسرائیل کا نام ونشان دنیا سے مٹ جائے تو یقیناً اس موقف کے سلسلے میں ہم پر جانب داری کا الزام نہیں آئے گا۔ البتہ اس بات کو آخری صداقت سمجھنا دراصل فریق مخالف سے تمام گفت وشنید کی راہ بند کردے گا اور پھر ہمارے پاس مسئلہ کے حل میں وہی ہیجان انگیز بیانات سامنے آئیں گے جن پر گذشتہ پچاس برسوں سے کاربند ہونے کے باوجود ہم کسی حل کی طرف تو کیا پہنچتے البتہ اس سنگین انسانی مسئلہ کو چلتے چلاتے شاعرانہ انداز سے نپٹانے کے خوگر ہوگئے ہیں۔ اگر ساری دنیا کے مسلمان اسرائیل پر ایک بالٹی پانی ڈال دیں تو اسرائیل کا وجود بہہ جائے یا اگر ساری دنیا کے مسلمان اسرائیل پر صرف تھوک دیں تو وہ اس تھوک میں دفن ہوجائے گا۔ یہ وہ شاعرانہ باتیں ہیں جو وقتی طور پر ہمارے خون میں گرمی تو ضرور پیدا کرتی ہیں البتہ ان کا قابل عمل ہونا خود کہنے والوں کے دل ودماغ پر واضح نہیں ہوتا۔

ایک طرف ایریل شیرون کی حکومت ہے جو ظلم وبربریت کے سارے ریکارڈ توڑ چکی ہے۔ حکومت کی پوری مشینری بدترین

طرح کے کرپشن کا شکار ہے۔ خود ایریل شیرون اور ان کے اہل خانہ کا ریکارڈ ریاستی خزانے کے حوالے سے انتہائی داغ دار رہا ہے ۔ دوسری طرف عرفات اور ان کے حواریوں کا ٹولہ ہے جس نے بےبس فلسطینیوں کے نام پر امدادی فنڈوں کا غتر بود کر رکھا ہے۔ نہ اسرائیل کے حکمرانوں کو مذہب یہود سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی عرفات کے پیش نظر ارض فلسطین میں کسی عادلانہ معاشرے کا قیام ہے، لیکن دونوں طرف جو لوگ جانیں دے رہے ہیں وہ خالص مذہبی جذبے سے سرشار ہیں۔ جو صدق دل سے یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی شہادت ایک مذہبی فریضہ ہے۔ کیا شیرون اور عرفات کی حکومتوں کو برقرار رکھنے کے لئے یا مستقبل کی دو علیحدہ علیحدہ غیر توراتی اور غیر قرآنی ریاستوں کے قیام کے لئے دونوں طرف سے انسانی جانوں کے اتنے بڑے نذرانے کا کوئی جواز ہے؟

اسرائیلی ریاست اور فلسطینی اتھارٹی دونوں ہی اپنے غیر دینی بلکہ بڑی حد تک دین مخالف لب ولہجہ کے باوجود اگر شدت پسند مذہبی عناصر کی حمایت برقرار رکھنے میں کامیاب ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں ہی طرف کی مذہبی قیادت، کہیں کم کہیں زیادہ مذہب کے نام پر تاریخ میں الجھ کر رہ گئی ہے۔ ایک ایسی تاریخ جسے ماضی کی طرف ہمارے تقدیسی رویے نے تقدس عطا کر رکھا ہے اور جس سے غایت دین کا کوئی واقعی تعلق نہیں۔ ضرور اس بات کی ہے کہ ہم محض ایک مسلم قومی نمائندے کی حیثیت سے مسئلہ کو دیکھنے کے بجائے دونوں نقطۂ نظر کو انتہائی کھلے دل سے سمجھنے کی کوشش کریں اور پھر کسی ایسی پے چیدہ صورت حال پر غایت قرآنی کی روشنی میں کسی قابل عمل حل تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ یہودی کہتے ہیں کہ ارض فلسطین میں محض ان کا چار مربع فٹ چلنا انہیں جنت میں پہنچا سکتا ہے۔ ان اوہامی تصورات کے لئے خود ان کی تورات سے کوئی دلیل نہیں لائی جا سکتی۔ ہاں تلمودی ادب میں ایسی بشارتوں کی کمی نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ معبد کے بغیر ان کی مذہبی زندگی ادھوری ہے۔ ہیکل سلیمانی کی مرکزی قربان گاہ کے بغیر ان کے یہاں قربانی کا کوئی تصور نہیں۔ مذہبی یہودی جنہیں سیاسی قیادت نے یرغمال بنا رکھا ہے جو عرصے سے ارض کنعان کی واپسی کی دعا کرتے آئے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی دو ہزار سال بعد اب انہیں اتنی قوت فراہم ہوگئی ہے کہ وہ ہیکل سلیمانی کی مذہبی زندگی کو دوبارہ بحال کر سکتے ہیں۔ لہذا وہ اس تاریخی موقع کو ہرگز کھونا نہیں چاہتے۔ دوسری طرف فلسطینیوں پر ہونے والے مظالم اور جبراً ان کی بے دخلی کا معاملہ بھی ایک ایسا روشن واقعہ ہے جس سے تاریخ اپنی آنکھیں بند نہیں کر سکتی۔ پھر یہ کہ قبلۂ اول کے حوالے سے مسجد اقصیٰ اور گنبد صحرا کا معاملہ بھی مسلمانوں کے لئے ایک خالص مذہبی معاملہ ہے جس نے ارض فلسطین کو ان کے نزدیک بھی یہودیوں کی طرح ارض مقدس بنا دیا ہے۔ لہذا دونوں قومیں ارض مقدس پر کسی قسم کی مصالحت کو سودا بازی سے تعبیر کرتی ہیں۔ انور سادات اور اسحاق رابین کی اپنے ہی ہم قوموں کے ہاتھوں موت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دونوں جگہ اس بارے میں کتنی شدت پائی جاتی ہے۔ یہ مسئلہ کا صرف ایک پہلو ہے جس نے اس پوری معرکہ آرائی کو خوں آشام بنانے میں مرکزی رول ادا کیا ہے۔

ایک ایسے مرحلے میں جب دونوں طرف شدت جذبات میں کسی منصفانہ اور معقول حل کے راستے بند دکھائی دیتے ہوں۔ جب ابراہیم کے ماننے والے، اسحٰق و اسمعیل کی صلبی اور روحانی اولادیں اسی ایک خدا کی عبادت گاہ کے حوالے سے بدترین خون خرابے میں مبتلا ہوں اور جب توحید کے علمبردار یہ بھول گئے ہوں کہ خدا کو کسی خاص مسجد یا کسی طرز کے معبد کے بجائے غیر مشروط سپردگی مطلوب ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم مسلمان حاملین قرآن کی حیثیت سے آگے آئیں اور لوگوں کو یہ بھولا ہوا سبق یاد دلائیں کہ اللہ کو جو کچھ مطلوب ہے وہ یہودی، عیسائی یا روایتی مسلمانیت نہیں اور نہ ہی کسی خاص شناخت کی طرز تعمیر اور ان میں ہونے والی فرقہ وارانہ عبادت۔ وہ تو ﴿کونوا هودا او نصاریٰ﴾ کو لائق استرداد سمجھتا ہے اور اس کا مطالبہ ﴿ملة ابراهیم حنیفا﴾ کا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ براہیمی سلسلے میں پائی جانے والی سعید روحیں ارض فلسطین کو اس موجودہ گرداب سے نکالنے کے لئے لوجه الله آگے آئیں۔حق کی حمایت میں وہ اس بات سے بے پروا ہو کر سوچیں کہ ان کی باتیں خود ان کی قوم کی ناراضی کا سبب بن جائے گی یا اس سے ان کے قومی مفاد کو نقصان پہونچے گا۔ گذشتہ دنوں جب اسرائیلی پارلیامان (Kanaset) کے ایک رکن ابراہیم برگ نے ریاست اسرائیل کو حقیقت پسندی کا مشورہ دیا تو یہودی دنیا میں انہیں دشمنوں کا معاون گردانا گیا۔ اہل یہود میں ابراہیم برگ جیسے لوگوں کی کمی نہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ اہل یہود سے متعلق ہمارا فہم قرآن مجید کے بجائے سید قطب کے معروف زمانہ کتابچہ معرکتنا مع اليهود کا پروردہ ہے جس میں بلا استثنیٰ تمام ہی یہود شیطانی گروہ کے پراسرار کردار کی حیثیت سے دکھائے گئے ہیں۔ ہم مدت سے ان تفسیروں کے اسیر ہیں جن میں ﴿غير المغضوب عليهم و لا الضالين﴾ سے بالتخصیص یہود و نصاریٰ مراد لئے جاتے ہیں۔ ہم شدت جذبات میں یہ نہیں سوچتے کہ قرآن مجید جو منصف اعلیٰ کا کلام ہے عہد رسول کے بعض یہودی قبائل یا افراد کی بدبختی کے لئے ان کی تمام آئندہ نسلوں پر لعنت کا فیصلہ کر سکتا ہے۔قرآن میں اہل قریش کے بعض کردار کی بھی شدید مذمت کی گئی ہے۔ کفار قریش کی دنیوی واخروی خسارے کا مژدہ سنائے جانے کے باوجود ہمارے گمان میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ تا قیامت کفار قریش کی اولادیں مغضوب الغضب ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ کسی خاص نسل کی شرارت کے لئے آنے والی تمام نسلوں کو باعث لعنت قرار دیا جائے۔ کچھ یہی معاملہ اہل یہود کی مذہبی فکر کا بھی ہے جو تلمودی تشریحات کے زیر اثر یہ سمجھ بیٹھی ہے کہ اہل یہود کی برگزیدہ قوم کے مقابلے میں غیر یہود کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ ان کا خون مباح اور ان کی ثقافت بے معنی ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم مسئلہ فلسطین پر روایتی فہم کے بجائے از سر نو غایت قرآنی کی روشنی میں غور وفکر کریں۔ تبھی ہم مسلسل تلف ہوتی ہوئی جانوں کو ضائع ہونے سے بچا سکیں گے اور فلسطین کی تاریخی سرزمین ماضی کی طرح مسلمانوں اور دیگر اہل کتاب کی عبادتوں سے معمور ہو سکے گی۔ کہاں گئے اہل کتاب کے وہ امة قائمة جن کے

بارے میں قرآن کہتا ہے کہ وہ راتوں کو اٹھتے اور خدا کی حمد ومناجات کرتے ہیں اور جن کے لئے قرآن کی بشارت ہے کہ ان کے نیک اعمال کی ناقدری نہیں کی جائے گی ﴿وما يفعلوه من خير فلن يكفروه﴾ لیکن ساتھ ہی ساتھ خود ہمارے اندر ایسے خداترس لوگوں کی دریافت ضروری ہے جو کمال جرأت کے ساتھ قومی مفاد سے اوپر اٹھ کر یہ کہہ سکیں ﴿يا اهل الكتاب تعالوا الى كلمة سواء بيننا و بينكم ألا نعبد الا الله و لا نشرك به شيئا و لا يتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون الله﴾ (آل عمران:٦٤)۔

(نوٹ: یہ تحریر یاسر عرفات کے انتقال سے قبل لکھی گئی تھی)

ضرورت اس بات کی ہے کہ عقل وآگہی کو ایک دوسرے کی ضد سمجھنے کے بجائے ایک دوسرے کا رفیق و مددگار قرار دیا جائے۔قدیم اسلامی تعبیرات کو ایسے منجمد عقائد (dogma) کی حیثیت سے نہ دیکھا جائے جسے negotiate نہ کیا جاسکتا ہو۔یہ کام خاصا آسان ہو جائے گا اگر ہم اس حقیقت کو تسلیم کرلیں کہ ہمارے متقدمین جنہوں نے ماضی میں تشریح وتعبیر کا فریضہ انجام دیا ہے وہ بھی ہماری طرح انسان تھے جن سے لغزشوں اور التباسات کا صدور فطری ہے۔ہم اس بات کے ہرگز سزاوار نہیں کہ دوسروں کے التباسات کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے پھریں۔ہمارے لئے ہمارے اپنے التباسات کا بوجھ ہی کیا کم ہے۔

بین المذاہب مکالمہ کے لئے

ایک نئی دینیات کی ضرورت

خواتین وحضرات!

حضرت مسیحؑ ان چند برگزیدہ انبیاء میں سے ہیں جن کا تذکرہ بڑے ہی والہانہ انداز میں قرآن مجید میں کیا گیا ہے۔ یہ بات آپ کے علم میں ہوگی کہ قرآن مجید کی ایک مکمل سورت آپ کی والدہ حضرت مریم علیہا الصلاۃ والسلام کے عنوان سے موسوم ہے جنہیں قرآن نے تمام مؤمن مردوں اور عورتوں کے لئے قدوہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ میں جب بھی سورۂ مریم کی تلاوت کرتا ہوں اس کے صوتی آہنگ، جملوں کے زیر و بم، اور مضامین کی رفعت سے روح وجد میں آجاتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کے لئے مسیح کی شخصیت سے الگ ہوجانا ممکن نہیں۔ مسیح ابن مریمؑ ہمارے ہیں اور ہم اہل ایمان مسیح ابن مریم سے ہیں اور اس حقیقت کے باوجود کہ آج متبعین محمد اور متبعین مسیح کے درمیان گہری خلیج حائل ہے۔ ہم نظری طور پر حضرت مسیح کو اپنے آپ سے جدا نہیں کرسکتے اور نہ ہی حضرت مسیح کے سچے متبعین سے اپنا رشتہ توڑ سکتے ہیں۔ حضرت مسیح پر ہمارا ایمان، خانوادۂ انبیاء کے دوسرے نبیوں کی طرح، ایمان کا جزو لاینفک ہے مگر افسوس اس بات کا ہے کہ مسلمانوں اور حضرت مسیح کے مابین اس گہرے تعلق کا صحیح ادراک اب تک عیسائی دنیا میں نہیں کیا جاسکا ہے۔

میرے مسیحی بھائیو اور بہنو!

اہل ایمان کے گروہ جس طرح معاصر تاریخ میں بے وزن اور بے وقعت ہیں شاید انسانی تاریخ میں اس سے پہلے کوئی نظیر نہیں ملتی۔ آج جن لوگوں کے ہاتھوں میں دنیا کا اقتدار اعلیٰ ہے انہیں مذہبی اقدار اور اعلیٰ انسانی اخلاق کی ہوا بھی نہیں لگی ہے۔ بیسویں صدی جو ابھی گذری ہے انسانی ہلاکت، اجتماعی قبروں، منظّم نسل کشی اور غیر انسانی نظریات کی ترسیل و اشاعت کے لئے پچھلی تمام صدیوں پر بازی لے گئی ہے۔ انسان انسانوں کے لئے بھیڑیا بن گیا ہے۔ جیمس فیریز کی طرح ہم میں سے بہت سے لوگ اس بات پر ایمان لے آئے ہیں کہ تہذیب محض ظاہری حسن کاری ہے، اسے کھرچیئے تو انسانی بہیمیت اپنی اصلیت ظاہر کر دے گی۔ آج چونکہ بہیمیت کو گلوبلائزیشن کا کاندھا بھی فراہم ہوگیا ہے لہذا اب پوری دنیا بھیڑ نما انسانوں کی چراگاہ بن گئی ہے۔

امریکی صدر جارج بش کے الفاظ میں there is no place to hide گویا جارج امریکی عزائم سے بچ نکلنے کا کوئی راستہ باقی نہیں رہ گیا ہے۔ کوئی جائے پناہ نہیں رہ گئی ہے۔ ہم میں سے بہت سے لوگ چاہتے ہیں کہ موجودہ دنیا کی سواری سے اتر آئیں لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ کوئی متبادل موجود نہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہم لوہے کے ایک پنجڑے میں قید ہوں جس کی دیواریں چہار سمت سے ہم پر تنگ کی جارہی ہوں۔ یہ ایک ایسی صورتحال ہے جو اس سے پہلے فرد کو کبھی پیش نہیں آئی۔ اس احساس کو صحیح نام دینے کے لئے ہماری لغت میں الفاظ موجود نہیں ہیں۔

صورتحال کی سنگینی کے پیش نظر آج میں آپ سے بلا تکلف کہہ دیتا ہوں کہ ہم خواہ مذہبی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہوں، ہم تمام لوگوں کا مستقبل اسی کرۂ زمین کے مستقبل سے وابستہ ہے جسے خدا بیزار انسانی قیادت ہر اعتبار سے تباہ و برباد کرنے اور بالآخر اس کی اینٹ سے اینٹ بجادینے کے درپے ہے۔ مختلف ممالک جو نیوکلیائی قوت بن چکے ہیں یا بننے کا خواب دیکھ رہے ہیں در اصل ایک ایسی سمت کے مسافر ہیں جس کی اگلی منزل انہیں معلوم نہیں۔ قوموں کے خواب سراب زدہ اور گمراہ کن ہیں۔ جھوٹی عظمتوں نے انہیں اپنی ساری قوت ایسے مقاصد کے لئے وقف کر دینے پر مجبور کیا ہے جس میں انسانیت کے لئے کوئی مستقبل نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ صورتحال اب انسانی ہاتھوں سے نکل گئی ہے۔ جن بوتل سے باہر آ گیا ہے۔ ساحروں کو پتہ نہیں کے اسے دوبارہ بوتل میں واپس کیسے بھیجا جا سکتا ہے۔ طرفہ یہ ہے کہ ہم صورتحال کا صحیح ادراک کرنے سے قاصر ہیں کہ ہماری آنکھیں وہی کچھ دیکھتی ہیں جو ذرائع ابلاغ دکھاتے ہیں اور چونکہ ذرائع ابلاغ پر انہی غاصب قوتوں کا پہرہ ہے اس لئے عام انسان صورتحال کی سنگینی کا واقعی اندازہ نہیں کر پا رہا ہے۔

ایک ایسی صورتحال میں جب دنیا پر تاریکی نے اپنے پنجے گاڑ دیئے ہوں، جب سرنگ کی دوسری طرف روشنی نظر نہ آتی ہو اور جب مختلف تہذیبوں میں پائی جانے والی سعید روحیں خود کو بے بس محسوس کرتی ہوں اور جب اس صورتحال سے پریشان ہو کر پوری دنیا، بالخصوص عیسائی معاشروں میں برملا یہ سوال کیا جانے لگا ہو کہ کہاں گئے وہ لوگ جنہیں حضرت مسیح نے زمین کا نمک اور دنیا کی روشنی کہا تھا اور جن سے یہ توقع تھی کہ ان تاریک ایام میں وہ دنیا کی رہنمائی کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ آج بھی نہ صرف چرچ کی اس مجلس میں بلکہ عیسائی دنیا کے مختلف ایوانوں میں مسیح کے سچے متبعین کے کانوں میں یہ صدا آرہی ہوگی۔

> ''یقین جانو تم زمین کے نمک ہو اور اگر نمک اپنی نمکینیت کھو دے تو پھر اسے کون نمکین کر سکے گا... تم تمام اقوام کے لئے مینارۂ نور ہو۔ ایک ایسا چراغ جو پہاڑی پر واقع ہو۔ جس کی روشنی میں ہر کوئی راستہ پا سکے۔ اپنی روشنی پر پردہ نہ ڈالو، اپنی روشنی سے ساری دنیا کو منور کر دو تمہاری روشنی سبھوں کے لئے مفید ثابت ہوتا کہ سب لوگ تمہارے آسمانی باپ کی نغمہ سرائی کر سکیں''۔ (متی ۵ آیات ۱۳ تا ۱۶)

مجھے یہ بات کہتے ہوئے بڑا قلق ہو رہا ہے کہ جو لوگ کبھی دنیا کے لئے مینارۂ نور تھے اب موجودہ تاریکی میں اپنے اس فرض

منصبی کو انجام نہیں دے رہے ہیں۔ ہمیں یہ تو نہیں کہنا کہ پوری عیسائی دنیا ظلمت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ہوسکتا ہے گاہے بگاہے ہمیں روشنی کے کچھ مناظر دکھائی دے جاتے ہوں۔ البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ فی زمانہ متبعین مسیح کی حیثیت مینارۂ نور کی نہیں رہ گئی ہے ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ ہم خود کو ظلمت میں اس طرح گھرا پاتے۔ آج کی اس مجلس میں میں نے قدرے بے تکلفی سے کام لیا ہے ایسا اس لئے کہ میں خود کو ان کے درمیان پاتا ہوں جنہیں زمین کے نمک اور مینارۂ نور سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ہم مسلمانوں نے متبعین مسیحؑ کو ہمیشہ اہل کتاب سے خطاب کیا ہے یعنی ایک ایسا طائفہ جو خدا کے سچے رسول کی پیروی کا دعویدار ہو اور جسے ایمان و انصاف کے حوالے سے قائل کیا جاسکتا ہو۔ قرآن مجید ہمیں اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ ہم اہل کتاب کے ساتھ مشترکہ محاذ ترتیب دیں اور وہ باتیں جو ہمارے اور ان کے درمیان مشترک ہیں ان کی بنیادوں پر مشترکہ جدوجہد کا پروگرام بنائیں۔ بالفاظ دیگر مجھے کہنے دیجئے کہ متبعین مسیحؑ اور متبعین محمدؐ کے لئے مشترکہ جدوجہد کی بنا ہمارے نزدیک نہ صرف یہ کہ قابل قبول ہے بلکہ قرآن مجید اس کا داعی بھی ہے۔ البتہ اس حقیقت کے اظہار میں مجھے تکلف نہیں برتنا چاہئے کہ ﴿یا اهل الكتاب تعالوا الى كلمة سواء﴾ کی دعوت ماضی میں بعض سیاسی وجوہ کے سبب اس طرح نہیں برتی جاسکی ہے جیسا کہ اس کا حق تھا۔ آیئے میں ذرا اس بات کی وضاحت کروں۔

اسلام کے ابتدائی ایام میں جب خدا کا آخری رسول ہمارے درمیان موجود تھا ہم مسلمانوں پر یہ حقیقت واضح تھی کہ انسانی تاریخ میں متبعین محمدؐ ایک خاص مقام پر فائز ہیں۔ یہودی اور عیسائی قوموں کے بعد انسانی تاریخ کی رہنمائی کی ذمہ داری ہمیں سونپی گئی ہے۔ قرآن نے بہت واضح الفاظ میں ہمیں بتایا ہے کہ محمد رسول اللہ کی دعوت بعینہ وہی دعوت ہے جو حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے انبیاء کے ذریعہ انسانوں کی طرف بھیجی گئی بلکہ قرآن نے تو اس بات کی صریح الفاظ میں وضاحت کی ہے کہ محمد رسول اللہ دین براہیمی کے احیاء کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ وہی ابراہیمؑ جسے قرآن مسلم حنیف کے لئے رول ماڈل کے طور پر پیش کرتا ہے اور جس کے سچے متبعین کے لئے کامیابی کی ضمانت دی گئی ہے۔

قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کی دعا کا مطالعہ یقیناً آپ کے لئے باعث دلچسپی ہوگا۔ ﴿ربنا واجعلنا مسلمين لك ومن ذريتنا امة مسلمة لك و ارنا مناسكنا وتب علينا انك انت التواب الرحيم﴾ (البقرة: ۱۲۸) ابراہیمؑ کی دعا قبول ہوئی اور ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کی اولاد سے انبیاء کا ایک سلسلہ جاری ہوا یہاں تک کہ یہ سلسلہ حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں محمدؐ رسول اللہ پر تمام ہوا۔ انبیاء کا یہ خانوادہ جس میں ابراہیم واسحٰق اسماعیل ویعقوب وسلیمان وداؤدؑ سبھی شامل ہیں، قرآن کہتا ہے، خدا کے سچے متبعین کی جگمگاتی کہکشاں ہے۔ ہم مسلمان ان تمام انبیاء پر ایمان لانا لازم خیال کرتے ہیں۔ ہمیں یہ تعلیم دی گئی ہے ﴿لانفرق بين احد منهم﴾۔ یہ سب کے سب ہمارے لئے قابل اتباع ہیں پھر ہم ان کے سچے متبعین اور ان سے اپنا رشتہ

جوڑنے والوں سے محبت ترک کر دیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کو ہم نے کبھی غیر نہ سمجھا۔قرآن ایسے لوگوں کی مدح و ستائش کرتا ہے جن کا تعلق اہل یہود اور اہل نصاریٰ سے ہے۔ ایسا اس لئے کہ ان میں سے بعضوں کی پیشانیاں سجدے سے معمور اور ان کے دل خشیت الٰہی سے لبریز ہیں۔قرآن مجید نے نہ صرف یہ کہ ہمیں مشترکہ جہد وعمل کی بنیاد فراہم کی ہے بلکہ اس نے ہمیں اہل کتاب سے سماجی اور معاشرتی رشتوں کی بھی اجازت دی ہے۔اہل کتاب کا کھانا ہمارے لئے حلال کیا گیا اور ہمیں اس بات کی اجازت دی گئی کہ ہم ان کی عورتوں سے رشتہ مناکحت استوار کریں۔قرآن کی پیدا کردہ یہی وہ وسعت قلبی تھی کہ جب عہد رسول میں نجران کے عیسائیوں کا ایک قافلہ مدینہ پہونچا تو رسول اللہ اس وفد کے ساتھ بڑی الفت و محبت سے پیش آئے، باوجود اس امر کہ کہ انہیں اپنے عیسائی بنے رہنے پر اصرار تھا۔ہم مسلمانوں کے دل ہمیشہ سے حضرت مسیح کے سچے متبعین کے لئے کھلے رہے ہیں اور حضرت مسیح کے سچے متبعین بھی ہمارے ساتھ لطف و مہربانی سے پیش آئے ہیں۔ ذرا اس حبشہ کے بادشاہ نجاشی کی مثال ملاحظہ فرمایئے جس نے مسلمانوں کو سیاسی پناہ دی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ نجاشی کی موت کی خبر جب مدینہ پہونچی تو رسول اللہ کو بڑا قلق ہوا آپ نے اس کے لئے غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔آپ نے کہا لوگو! آج تمہارا ایک بھائی رخصت ہوگیا ہے اس کی مغفرت کی دعا کرو۔ مسلمانوں کی پہلی نسل خود کو عیسائیوں سے کتنا قریب سمجھتی تھی اس کا اظہار قرآن کی ان آیات سے ہوتا ہے جن میں ایرانیوں کے ہاتھوں رومی عیسائیوں کی شکست پر قرآن نے مسلمانوں کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ جلد ہی اہل ایمان کو اس صدمے کے ازالہ کی خوشخبری ملے گی جب رومی عیسائی کے ہاتھوں ایرانی لشکر شکست پائے گا۔

حتیٰ کہ ان ایام میں جب اسلامی تحریک پر خطرات کے بادل منڈلا رہے تھے اور جب یہود و نصاریٰ سے مسلمانوں کو متوقع تعاون ملنے کے بجائے ان کی طرف سے مسلسل مخالفتوں اور ریشہ دوانیوں کا سامنا تھا ان حالات میں بھی اہل کتاب کے سلسلے میں مسلم فکر کو مجروح نہیں ہونے دیا گیا، ہماری وسعت قلبی بدستور باقی رہی۔ رسول اللہ انہیں اہل کتاب قرار دیتے رہے اور قرآن اس بات کا برملا اعلان کرتا رہا کہ ﴿لیسوا سواءً من اهل الكتاب امة قائمة يتلون آيات الله آناء الليل وهم يسجدون﴾ (آل عمران:۱۱۳) اور یہ کہ ﴿ومن قوم موسى امة يهدون بالحق﴾ (الأعراف:۵۹)۔ رہی عیسائیوں کی بات تو عیسائیوں کے سلسلے میں ہم نے ہمیشہ تعلق خاص کا اظہار کیا ہے۔ بقول قرآن ”تم اہل ایمان سے محبت میں ان لوگوں کو قریب پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے درمیان علماء، اور عبادت گذار افراد پائے جاتے ہیں اور اس وجہ سے بھی کہ وہ تکبر نہیں کرتے“ (مائدہ:۸۲)۔

قرآن نے چونکہ اہل کتاب کو ایسے گروہ کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے جو مسلمانوں ہی کی طرح خدا کی اتباع کو اپنی قومی زندگی کے لئے سبب افتخار قرار دیتا ہے اس لئے مسلمانوں نے ہمیشہ سے اہل کتاب کی طرح احترام و رواداری کا مظاہرہ کیا ہے۔

مسلم ریاستوں میں انہیں اعلیٰ مناصب دیا جانا اور انہیں مذہبی آزادی کی ضمانت اسی بات پر دال ہے۔ اسلامی ریاست اہل کتاب کے حقوق کے سلسلے میں اتنے حزم واحتیاط کا مظاہرہ کرتی رہی ہے کہ جب حضرت عمر فاتح کی حیثیت سے یروشلم میں داخل ہوئے تو صرف اس خیال سے آپ نے چرچ کے اندر نماز پڑھنا مناسب خیال نہ کیا کہ مبادا ان کا یہ عمل مسلمانوں کے لئے چرچ کو مسجد میں تبدیل کرنے کا سبب بن جائے۔ حتیٰ کہ چرچ کے باہر جن سیڑھیوں پر آپ نے نماز ادا کی اس بارے میں بھی آپ نے یہ تحریری ضمانت دینا ضروری سمجھا کہ مسلمان صلوۃِ عمر کو نظیر بناتے ہوئے اس جگہ کو مسجد میں تبدیل نہ کردیں۔

رہی یہ بات کہ اہل کتاب کے معابد تو اس بارے میں اگر مسلمانوں نے احترام ورواداری کا مظاہرہ کیا ہے تو اس کی بنیاد بھی قرآن میں موجود ہے۔ بالفاظ قرآن ﴿ولو لا دفع الله الناس بعضهم ببعض لهدمت صوامع و بيع و صلوات و مسجد يذكر فيها اسم الله كثيرا﴾ اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ نہ ہٹاتا رہتا تو یہ خانقاہیں چرچ، سناگاوگ اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام لیا جاتا ہے ڈھادی جاتیں (الحج: ٤٠)۔ مسجدوں کے ساتھ ساتھ خانقاہوں چرچ اور سناگاوگ کا تذکرہ اور پھر یہ کہنا کہ ان میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے اس بات پر دال ہے کہ مسلمانوں کو اہل کتاب کے معابد کو بنظر احترام دیکھنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ ابتدائی ایام میں مسلم ذہن پر یہ حقیقت روشن تھی کہ ان کی دعوت تمام انبیاء کی دعوتوں کا ارتکاز ہے۔ ان سے پہلے جو لوگ کتابوں کے حاملین رہے ہیں۔ انہوں نے بھی دنیا کو بندگیٔ رب کی دعوت دی ہے۔ اب چونکہ آخری نبی کی حیثیت سے مسلمان منصب سیادت پر فائز ہیں اس لئے دنیا کے تمام اہل ایمان کی کمانڈ ان کے ہاتھوں میں ہے جب تک مسلمان خود کو اس منصب عظیم کا حامل سمجھتے رہے وہ اہل کتاب کی قوتوں کو کلمة سواء کی بنیاد پر عظیم نبوی مشن کے لئے استعمال کرتے رہے۔ البتہ جب سے انہوں نے بعض سیاسی اور معاشی عوامل کے تحت خود کو امت مامور کے بجائے اہل کتاب ہی کی طرح ایک عام امت سمجھنے لگے، ان کی وسیع النظری اور رواداری کو گھن لگ گیا۔ ہمارے علماء وفقہاء اہل کتاب کے سلسلے میں تحفظ ذہنی کے اسیر ہوگئے اور ہمیں ایسا محسوس ہونے لگا گویا کلمۃ سواء کے مشترکہ پروگرام میں اب اہل کتاب کی وہ اہمیت باقی نہیں رہی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جب عباسی بغداد میں بعض اہل یہود کو کلیدی عہدے عطا کئے جانے لگے تو اس صورت حال نے مسلمانوں میں قومی طرز فکر رکھنے والوں کو اندیشوں میں مبتلا کردیا۔ اموی دور حکومت ہی سے کلیدی مناصب کی تقسیم میں قبائلی عصبیت کارفرما ہوگئی تھی۔ لوگ اس بات کو حق بجانب سمجھنے لگے تھے کہ اعلیٰ عہدوں پر تقرری میں خاندانی تعلقات اور قومی شناخت کو بھی مدنظر رکھا جائے۔ دوسری طرف اہل یہود کے بعض خاندان بعض انتظامی اور معاشی علوم میں اپنی سبقت کی وجہ سے خصوصی امتیاز کے حامل تھے۔ جس کی وجہ سے حکومت کی نگاہ انتخاب ان پر پڑ رہی تھی۔ اسی عہد میں قومی مسلمانوں کی طرف سے بعض ایسی روایتیں وضع کی

گئیں جن سے یہ بتانا مقصود تھا کہ اہل کتاب کو اسلامی ریاست میں اہم مناصب عطا نہیں کئے جا سکتے۔ کہا جاتا ہے کہ بنو قریظہ کے قتل کا قصہ جو بعد کے عہد میں سیرت کی کتابوں میں تواتر کے ساتھ نقل ہوا ہے، ابن اسحاق اور دوسرے مؤرخین کے ہاتھوں اسی عہد میں تشکیل پایا ہے۔ ہمارے عہد میں بعض ایسی تحقیقات منظر عام پر آئی ہیں جس نے اس واقعہ کے سلسلے میں سخت شبہات پیدا کر دیئے ہیں۔ نبی رحمت کے ہاتھوں کسی قبیلہ کے اجتماعی قتل عام کو نہ صرف یہ کہ ذہن قبول نہیں کرتا بلکہ تاریخ بھی اس کو تسلیم کرنے سے انکاری ہے۔ ان تراشیدہ قصوں کے اثرات ہی کا نتیجہ تھا کہ اہل کتاب کے سلسلے میں عہد عباسی میں ہمارے فقہا و مفکرین کے نظریے بدلنے لگے اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ کفار کی طرح اہل کتاب کو بھی، جنہیں اب تک ہم قرآنی دائرۂ فکر میں ایمانی گروہ سمجھتے رہے تھے، صاغرون بن کر رہنا ہوگا۔

اہل کتاب اور دوسرے گروہوں کی طرف ہماری وسعت قلبی کے خاتمہ نے ہمیں ایک قومی امت کے حصار میں محصور کر دیا اور ہم جو اب تک تمام نوع انسانی کے لئے انصاف مساوات اور حریت کے حصول کو اپنا مقصد قرار دیتے تھے اب ان عظیم مقاصد کو ہم نے صرف اپنی قوم کے لئے مخصوص کر دیا۔ اہل کتاب کے سلسلے میں ہمارے اس نئے رویے کی تشکیل میں بنو قریظہ سے متعلق تراشیدہ قصے اور معاہدہ عمر کے مفروضہ دستاویز نے کلیدی رول ادا کیا ہے۔ ہمارے مفکرین نے اس بات پر غور کرنے کی ضرورت کم ہی سمجھی کہ بنو قریظہ کا مفروضہ واقعہ نہ صرف یہ کہ قرآن کے بنیادی اصولوں سے ٹکراتا ہے بلکہ خود اس واقعہ کے بیان میں اتنے تضاد موجود ہیں کہ اس کی بنیاد پر کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ دوسری طرف معاہدہ عمر کے مختلف متن تاریخ کی مختلف کتابوں میں ملتے ہیں۔ ہر متن ایک دوسرے پر اضافہ معلوم ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اس دستاویز کو حضرت عمر جیسی جلیل القدر شخصیت سے منسوب کرنا مناسب نہیں اور نہ ہی کسی ایسے مشکوک دستاویز کی بنیاد پر اہل کتاب کے سلسلے میں ایک ایسا نقطۂ نظر تشکیل دیا جا سکتا ہے جو انہیں حلیف کے بجائے حریف کے طور پر پیش کرے۔ افسوس اہل کتاب کے سلسلے میں عہد عباسی میں ہمارے رویہ نے جو کروٹ لی اس کی بنیادیں قرآن کے بجائے اس تاریخ میں ہے جس کی سند مشکوک ہے۔ مجھے اس بات کو بھی تسلیم کرنے میں کوئی تکلف نہیں ہے کہ خلافت علی منہاج النبوۃ جب اپنی اصل بنیادوں سے ہٹ کر ملوکیت کی راہ پر گامزن ہوگئی تو اس دور میں ہم نے اسلام کی اشاعت کے بجائے مسلم قومی افتخار کا علم بلند کرنا ضروری سمجھا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل کتاب سے ہمارے رشتوں کی دینی بنیاد نہ صرف یہ کہ متاثر ہوئی بلکہ ہم انہیں قومی افتخار کے پروجیکٹ میں رکاوٹ کے طور پر دیکھنے لگے۔ اب چونکہ نہ ہم اس انبیائی مشن کے حامل تھے اور نہ ہی اہل کتاب کو اپنا حلیف بنانے کی ضرورت سمجھتے تھے اس لئے فقہاء اسلام نے آگے چل کر ان کے ساتھ سماجی رابطوں کے سلسلے کو منقطع کرنے کی کوشش کی۔ کتابیہ عورت سے نکاح کو معیوب سمجھا جانے لگا۔ ہمارے مفکرین یہ سمجھنے لگے کہ مسلمانوں کی قومی ریاست اسلام کے بجائے عرب عصبیت سے قوت حاصل کر سکتی ہے اور یہی اس کے لئے

نقطہ اتحاد ہوسکتا ہے۔ اسلام سے عرب عصبیت تک کے اس سفر نے مسلم ذہن کو ایک بڑے بحران سے دوچار کر دیا۔ جلد ہی دنیا نے دیکھا کہ مسلمان اور نصاریٰ جو کبھی فطری حلیف تھے، دوسو سالوں تک مسلسل ایک دوسرے سے نبرد آزما رہے۔ صلیبی جنگوں نے نہ صرف یہ کہ عیسائی مسلم تعلقات کی دینی بنیادیں ہلا دیں بلکہ آنے والی صدیوں میں مسلمانوں کے سلسلے میں عیسائی نقطہ نظر کی تشکیل میں ان جنگوں نے کلیدی رول ادا کیا۔ پروپیگنڈہ اتنا شدید تھا کہ یورپ میں صدیوں محمد رسول اللہ کو جھوٹے پیغمبر اور بہروپیے (نعوذ باللہ) کی حیثیت سے دیکھا جاتا رہا حتیٰ کہ اٹھارہویں صدی تک لندن کے اسٹیج ڈراموں میں محمد رسول اللہ کو ایک ایسے شخص کی حیثیت سے پیش کیا جاتا رہا جو بقول ان ڈراموں کے پوپ بننا چاہتا تھا لیکن جب ان کی خواہش پوری نہ ہوئی تو انہوں نے عیسایت کے خلاف ایک نیا مذہب ایجاد کر ڈالا۔ شکیسپیر کے ڈراموں میں foul fiend Mahu کی گونج اور دانتے کی ڈوائن کامیڈی میں رسول اللہ کو جہنم کے مرکزی حصے میں دکھایا جانا اس مخالفانہ پروپیگنڈہ کی بیّن مثال ہے۔ اسلام کے خلاف اس متعصّبانہ پروپیگنڈہ نے یورپ کے ادب کو جس طرح متاثر کیا ہے آج مغربی ذہن پر اس کے اثرات پڑ رہے ہیں کچھ یہی حال ہمارے علماء کی ان تحریروں کا ہے جو صلیبی جنگوں کے تناظر میں اہل نصاریٰ کے سلسلے میں لکھی گئی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس قدیم فقہی مکالمہ کا صلیبی جنگوں سے اوپر اٹھ کر جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ یہ قدیم فقہی محاکمہ قرآنی دائرہ فکر کی پوری پوری پاسداری کرتے ہیں یا نہیں گویا دونوں طرف فقہی اور مذہبی ادب کے بے لاگ محاکمہ کی ضرورت ہے اگر مسلمانوں کو ایک طرف اہل کتاب کے سلسلے میں فقہی مباحث کو قرآنی دائرہ فکر میں از سرِ نو تشکیل دینے کی ضرورت ہے تو دوسری طرف عیسائی علماء پر بھی لازم ہوگا کہ وہ بائبل میں موجود حضرت مسیح کے خطبوں کی روشنی میں اسلامی مشن کا صحیح اور منصفانہ محاکمہ کریں گویا دونوں طرف ایک نئی دینیات تشکیل دیئے بغیر مسلمان اور اہل کتاب پھر سے فطری حلیف نہیں بن سکتے ہیں۔ یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ دنیا میں مختلف شعوب وقبائل کا پایا جانا اور مختلف انبیاء کے ایمانی طائفے دراصل خدائی اسکیم کا حصہ ہیں۔ خدا نے ہمیں مختلف اقوام وملل میں پیدا کیا ہے اور مختلف ایمانی سلسلوں میں ہماری شناخت تشکیل دی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہم مختلف ایمانی حوالوں سے جانے جائیں۔ ﴿ولو شاء الله لجعلهم امة واحدة﴾ (الشوری:۸) ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ہم خیر کے کاموں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کریں لیکن اس کے برعکس ہوتا یہ ہے کہ ہر گروہ نجات کو صرف اپنے لئے مخصوص سمجھنے لگتا ہے۔ حالانکہ ان نازک امور پر گفتگو سے قرآن اور بائبل دونوں جگہ منع کیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔ ﴿ان الله يفصل بينهم يوم القيامة﴾ اور مجھے یقین ہے کہ آپ حضرات بائبل کے فرمان thou shall not judge سے بھی واقف ہوں گے۔ جب خدا نے نجات کے معاملہ کو اپنے ہاتھ میں رکھا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اہل ایمان کے طائفہ کو جہنم رسید کرنے میں ہم اپنی قوتیں ایک دوسرے پر صرف کریں۔

عزیز بھائیو اور بہنو!

فرد کی طرح ہر نسل اپنی فہم وبصیرت کے لئے خود ہی جواب دہ ہے۔ ہمارے متقدمین کی فہم وبصیرت کا حساب ہم سے نہیں لیا جائیگا۔﴿تلك امة قد خلت لها ما كسبت ولكم ما كسبتم و لا تسئلون عما كانوا يعملون﴾ (البقرة:۱۳٤)ہم اس بات کے ہرگز سزاوار نہیں کہ متقدمین کی لغزشوں کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھائے پھریں اگر آج ہم متقدمین کی تحریروں کو حرف آخر کی حیثیت سے دیکھنے کی کوشش کریں گے تو کسی نئی ابتداء کا امکان سرے سے ختم ہوجائے گا۔ صلیبی جنگیں کب کی ختم ہوچکی ہیں تب سے اب تک انسانی تاریخ نے ایک طویل سفر طے کیا ہے۔ ہمیں یہ بات بھی نہیں بھلانی چاہئے کہ آج جولوگ ہمارے درمیان تہذیبی جنگ کا بگل بجارہے ہیں وہ عیسائیت کے سچے نمائندہ یا حضرت مسیح کی تعلیمات کے سچے امین نہیں ہیں اور نہ ہی انہیں ساری عیسائی دنیا کی حمایت اور سرپرستی حاصل ہے۔ جولوگ جدید دنیا کو عیسائی مسلم خانوں میں بٹی دیکھتے ہیں وہ دراصل صورتحال کے صحیح محاکمہ سے قاصر ہیں۔ سچ تو یہ ہے آج پوری نوع انسانی باطل کے ہاتھوں دہشت زدہ ہے۔ اہل ایمان کے تمام ہی طائفوں کی یہ مشترکہ ذمہ داری ہے کہ وہ معاصر دنیا کو جنگ کی تباہ کاری اور ناانصافی کی عقوبت گاہ سے نجات دلائیں۔ مجھے اندازہ ہے کہ اس وقت عیسائی دنیا میں مسلمانوں کے خلاف جس طرح نفرت پھیلا دی گئی ہے اور جس طرح اسلام اور مسلمانوں کو موت ودہشت کا ایجنٹ باور کرانے کی کوشش کی جارہی ہے، عیسائی علما اور مغربی مفکرین کے لئے اپنے ثقافتی ادب سے دست کش ہونا کچھ آسان نہ ہوگا۔ اور نہ ہی ان کے لئے یہ آسان ہوگا کہ وہ خالص تعلیمات مسیح کی روشنی میں اسلامی مشن کا محاکمہ کرسکیں۔ نفرت کی اس فضا میں اسلام کی غیر جانبدارانہ تفہیم یقیناً ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ لیکن اگر ہمیں دنیا کو جنگ وناانصافی سے بچانا ہے تو اس سرزمین پر پائے جانے والے اہل ایمان کے تمام طائفوں کو مشترکہ جدوجہد کے لئے آگے آنا ہوگا۔ مجھے یقین واثق ہے اس عظیم کام میں اللہ کی نصرت اور رہنمائی ہمارے شامل حال ہوگی۔ والذين جاهدوا فينا لنهدينهم سبلنا اور مجھے یقین ہے کہ ایک نئی ابتداء کے لئے ہمارے عیسائی بھائی بہنوں کے کانوں میں بھی حضرت مسیح کی ان ایمان افروز صداؤں کی گونج سنائی دے رہی ہوگی:

Ask, and it shall be given you;
Seek, and ye shall find;
Knock, and it shall be opened unto you.

امت مسلمہ کا تمام تر انحراف اور اس کے زوال کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم نے قرآن مجید کے ارد گرد تاویلات کا حصار کھڑا کر رکھا ہے۔ ہم کسی مسئلے پر قرآن مجید کو بولنے ہی نہیں دیتے۔ اس کے برعکس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مسئلہ مذکورہ پر ہمارے مکتبۂ فکر کے فقہاء نے کیا لکھا ہے۔ رہے وہ مسائل جن کا بیان ان کتب میں نہیں پایا جاتا تو ہم ہر نئی چیز کی اس وقت تک مزاحمت کرتے ہیں جب تک وہ رائج ہو کر ہمیں خود اپنے حصار میں لے لے۔ لاؤڈ اسپیکر کے استعمال سے لے کر مشینی ذبیحے تک ہمارے علماء نے پہلے تو ہر چیز کو حرام قرار دیا پھر رفتہ رفتہ وہی حرام اتنا پسندیدہ ہو گیا کہ اب مائک کے بغیر کوئی مولوی تقریر کرنا پسند نہیں کرتا۔

اسلام میں اصلاحی تحریک کی معنویت

فی زمانہ مکہ سے واشنگٹن تک اسلام کی تجدید واصلاح کا غلغلہ ہے گو کہ اسلام میں اصلاحی تحریک کا تصور کوئی اجنبی خیال نہیں ہے۔ البتہ اصلاح کے جو شدید داعیات اس وقت پائے جاتے ہیں شاید ایسی شدت اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی اور اس حقیقت کے باوجود کہ اسلام میں تجدید واصلاح کی نظری اساس پائی جاتی ہے آج اسلام کو اندر سے بدلنے کے لئے جو خارجی عوامل کام کررہے ہیں اس نے اس کی تجدید واصلاح کی ہر مخلصانہ کوشش کو شبہات کے دائرے میں داخل کردیا ہے۔ مزید برآں مغرب میں جو دانشور اس وقت اصلاح کے علمبردار ہیں ان کا اصل ہدف اسلام کو عصری تناظر سے ہم آہنگ کرنے کے بجائے یہ ہے کہ اسلام کو کس طرح قابو میں کیا جائے تاکہ ایک ایسے اسلام کی تشکیل ممکن ہو جو مغرب کے liberal frame work میں فٹ آسکے۔ مغرب نے اس سے پہلے عیسائیت اور یہودیت کے ساتھ اسی نہج پر کامیاب تجربات کئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اگر اہل یہود اور اہل کلیسا کی طرح مسلمان بھی مغرب کے موجودہ سرمایہ دارانہ نظام سے خود کو ہم آہنگ کرسکیں تو مغرب کے لئے اس کے سب سے خطرناک مفروضہ دشمن اسلام سے بزور بازو نمٹنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جائے گی۔

تحریک اصلاح کے علمبرداروں میں ایک طبقہ ان مسلم دانشوروں پر مشتمل ہے جن کی تعلیم وتربیت مغربی دانش گاہوں میں ہوئی ہے۔ مسلمان مصلحین کی یہ نسل خود کو ابن حزم، داؤد ظاہری، ابن تیمیہ، ابو حامد غزالی، محمد بن عبدالوہاب، شاہ ولی اللہ اور ان جیسے دیگر مصلحین کا توسیعہ سمجھتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اگر ماضی میں مسلمان تحریک تجدید واصلاح کا والہانہ استقبال کرتے آئے ہیں اور ان دلوں میں اپنے مصلحین کے لئے تحسین کے جذبات پائے جاتے رہے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ جب آج اس تجدیدی عمل کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے ہم اصلاحی تحریک پر اعتراض وارد کریں۔ البتہ ماضی کی طرح یہ سوال ابھی تک حل طلب ہے اگر ماضی کی اصلاحی تحریکیں اسلام کو اس کے اصل قالب تک لوٹانے میں ناکام رہی ہیں اور اگر ماضی میں تجدید و اصلاح کی کوششیں امت مسلمہ پر ایک نئی صبح طلوع کرنے میں کامیاب نہ ہوسکیں تو آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ اجتہاد کی یہ سعیِ بلیغ آج بامراد ہوسکے گی۔ گزشتہ کئی صدیوں سے مسلم مصلحین کتاب وسنت کی طرف واپسی کی صدا لگاتے رہے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے

کہ صدیوں کی ان شب و روز جدو جہد کے باوجود رجوع الی الکتاب والسنۃ کا خواب ہنوز ابھی شرمندۂ تعبیر ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ ہمیں اس بات پر اپنی توجہ مرکوز کرنا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ہمارے بہترین دماغ اور مخلصانہ جدو جہد رجوع الی القرآن کے ہدف کو حاصل کرنے میں ناکام رہی گویا عہد جدید کے مصلحین پر دوہری ذمہ داری آپڑی ہے۔ اولاً انہیں کمالِ ژرف نگاہی سے اس بات کا جائزہ لینا ہے کہ متقدمین کی ناکامیوں کی بنیادی وجوہات کیا تھیں۔ ثانیاً انہیں ساتھ ہی اس بات کا التزام بھی کرنا ہے کہ فی زمانہ رجوع الی القرآن کی کامیاب کوششوں کے لئے کس طریقۂ کار کا اختیار کرنا مناسب ہوگا اور یہ کہ کس طرح ایک بار پھر اسلام کی حقیقی روح ہم پر منکشف ہو سکے گی۔ گویا جدید مصلحین کو ابتدا ہی سے اس بات کا التزام کرنا ہوگا کہ وہ تاریخی اسلام اور نظری اسلام میں نہ صرف یہ کہ امتیاز کریں بلکہ مطالعۂ قرآنی میں ایک ایسے منہج کی داغ بیل ڈالیں جس کے ذریعہ انسانی تعبیرات اور التباسات کے پردوں کا چاک کیا جانا ممکن ہو۔ اور یہ جب ہی ممکن ہے جب ہر مسلّمہ کو از سرِ نو تحقیق و تجربہ کا موضوع بنایا جائے اور ہر مسئلہ پر قرآنی دائرۂ فکر میں از سرِ نو گفتگو کا آغاز ہو۔ یقین جانئے اگر ہم قرآن مجید کو حکم مانتے ہوئے اپنے تہذیبی اور علمی ورثے کا ناقدانہ جائزہ لینے کی جرأت پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ہم خود کو فکری طور پر نزولِ وحی کے ان ایام میں پائیں گے جب وحی کی ضیا پاشیاں ہمارے قلب و نظر کو منور اور ہمارے ملی وجود کو طمانیت سے سرشار رکھتی تھیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے اعترافِ حقیقت کے طور پر اور آزادانہ غور و فکر کی راہ ہموار کرنے کے لئے ہمیں یہ کہہ لینے دیجئے کہ ماضی میں اصلاحی تحریکیں اپنی تمام تر رفعتوں کے باوجود اگر اسلام کے اس نظری ماڈل کی بازیافت میں کامیاب نہ ہوسکیں یا اپنی تمام تر خواہشوں کے باوجود عہد رسول کے Spatial ماحول میں ان کی واپسی ممکن نہ ہوسکی تو اسکی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہمارے مصلحین عہد رسول میں واپسی بطریقِ مسلکِ فقہی چاہتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی اس سدّ تاریخ کو عبور کرنے کے لئے تیار نہ تھا جو حنفی، شافعی یا دوسرے فقہی فکر کے ارتقاء نے ان کے سامنے کھڑی کر دی تھیں۔ اقبال جیسا صاحبِ بصیرت جو قرآنِ مجید کے گہرے مطالعے کی وجہ سے بلا شبہ منصبِ اجتہاد پر فائز تھا خود کو یہ کہنے پر مجبور پاتا ہے کہ وہ عادتاً حنفی ہے گویا بخاطر سہولت انہوں نے حنفیت کا دامن تھام رکھا ہے۔ کچھ یہی حال ان تمام مفسرین اور ائمہ اصلاح کا بھی ہے جو تمام عمر دین مبین کی شخصی تعبیر سے اپنا دامن چھڑانے کے باوجود خود کو کسی نہ کسی فقہی خیمے کا توسیعہ بتاتے رہے ہیں۔ جب یہ خیال عام ہو چکا ہو کہ چار فقہی مکاتب سے ماوراء اہل سنت والجماعت کے ہاں دین مبین کی کوئی مستند تعبیر ممکن نہیں تو یہ کیسے ممکن تھا کہ اس فقہی سدّ تاریخ کو عبور کرتے ہوئے کوئی مصلح قرآن کے واقعی دائرۂ فکر میں واپسی کا ہدف حاصل کر پاتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رجوع الیٰ القرآن کی تمام تر تحریکیں قرآنی دائرۂ فکر میں واپسی کے بجائے متعلقہ فقہی خیموں کی توسیع اور اس کے استحکام پر منتج ہوئیں جس کی وجہ سے وحی ربانی کی اصل آب و تاب کے ساتھ بازیافت ممکن نہ ہوسکی۔

اس میں شبہ نہیں کہ فی زمانہ ماضی کے مقابلے میں تحریکِ اصلاح کے لئے کسی واقعی کامیابی کے امکانات کہیں زیادہ ہیں۔ اولاً امت کے علماء و دانشوروں پر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ فکر و نظر کے قدیم فقہی زاویے جدید دنیا کا محاکمہ نہیں کر سکتے۔ ثانیاً تجدید و احیائے اسلام کی تحریکیں اپنی تمام تر والہانہ سرگرمیوں کے باوجود مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں ناکام رہی ہیں اور یہ کہ اس طرزِ عمل کو مزید طول دینا مستقبل میں بھی کسی کامیابی کی ضمانت نہیں بن سکتا۔ ثالثاً یہ بات اب ہر خاص و عام پر واضح ہوتی جا رہی ہے کہ انٹرنیٹ کے عہد میں اب کوئی isolationist طریقۂ کار کامیاب نہیں ہو سکتا اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ اس سکڑتی دنیا میں کوئی بھی مذہبی گروپ صرف اپنی نجات کے لئے اردگرد سے بے تعلق ہو کر کوئی قابلِ عمل طرزِ زندگی تشکیل دے سکے۔ رابعاً اہلِ فکر کے حلقوں میں یہ خیال اب رفتہ رفتہ عام ہوتا جا رہا ہے کہ مسلم فکر جو مختلف تاریخی مراحل طے کرتے ہوئے مختلف شارحین کی مداخلت اور تعبیرات کے نتیجے میں موجودہ مروجہ شکل میں سامنے آئی ہے اس میں وحی کی تجلیاں اب اس روایتی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر نہیں ہیں۔ اس لئے مسلم فکر میں انسانی تعبیراتی عناصر کی نشاندہی اب ضروری ہو گئی ہے۔ تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ وحی جیسے نتائج تعبیراتِ وحی سے حاصل نہیں کئے جا سکتے۔ خامساً ایک borderless world کے وجود میں آ جانے سے پہلی بار یہ احساس عام ہوا ہے کہ اقوامِ عالم کی امامت پر فائز امت اور رحمۃ للعالمین کے متبعین آج ایک all-embracing وسعت کے بجائے اپنے دل و دماغ کو فرقہ وارانہ طرزِ فکر کا اسیر پاتے ہیں۔ ان کے ایجنڈے میں امت محمدیہ کی نجات اور اس کی فلاح و بہبود کی باتیں اتنی عام ہیں کہ غیر اقوام ان کی باتوں میں کوئی کشش محسوس نہیں کرتیں۔ گویا عرصے سے وہ مفروضہ دارالاسلام میں محصور فلاحِ امت کے منصوبوں میں اتنے مشغول رہے کہ رحمۃ للعالمینی کا عنصر ان کی شخصیت سے یکسر محو ہو گیا ہے۔ بے لوث پیمبرانہ صدا کی تلاش اور دکھے دلوں کی مسیحائی کے لئے عام انسانوں کی نگاہیں اب ان کی طرف نہیں اٹھتیں۔ یہ ایک ایسا قلق ہے جس کی چبھن اہلِ فکر مسلمان شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔ گویا ماضی کے مقابلے میں آج وحیِ ربانی کی بازیافت کے امکانات پہلے سے کہیں زیادہ ہیں۔ البتہ وحی ربانی کی بازیافت کے لئے کسی منہج کے تعین کے سلسلے میں ہنوز خوفناک سنّاٹا طاری ہے۔ خطرہ ہے مبادا ایسا نہ ہو کہ دائرۂ فکرِ قرآنی میں واپسی کا یہ زریں موقع بھی گنوا دیا جائے اور عالمِ انسانیت مزید چند صدیوں کے لئے آخری وحی کی تجلیوں سے محروم رہ جائے۔

تحریکِ تجدید و اصلاح کا مجوزہ منہج

تحریکِ اصلاح کا ہدف اسلام میں کوئی اساسی تبدیلی نہیں بلکہ ان انسانی تعبیرات کا محاکمہ ہے جو اپنے تاریخی اور مکانی تناظر کے غیاب کی وجہ سے اب فرسودہ معلوم ہوتی ہیں۔ جدید مصلحین کے دل و دماغ پر یہ بات واضح ہونی چاہئے کہ ان کا کام

انسانی تعبیرات کے التباسات سے اپنا دامن بچانا ہے۔ وہ اس بات کے ہرگز سزاوار نہیں کہ نصِ قرآنی میں تغیر و تبدل کی سفارش کریں۔ ساتھ ہی ہمیں اس بات کا بھی خیال رکھنا ہوگا کہ قدیم تعبیرات، اس کی تراش و خراش اور اس کے حصار سے باہر آنے کی کوشش اگر سابقہ انداز سے ہی جاری رکھی گئی تو نئی تحریک اصلاح کے نتائج بھی ماضی کے ناکام تجربوں سے مختلف نہ ہوں گے۔ گویا نئی تحریکِ اصلاح ابتداء سے انتہا تک ایک نئے لب و لہجے اور منہج کی حامل ہوگی جس کے بارے میں وثوق کے ساتھ یہ کہا جاسکے کہ ماضی کی تمام جدوجہد کے مقابلے میں یہ کہیں ہمہ گیر اور اپنے منہج میں روحِ قرآنی سے قریب تر ہوگی۔ اس مرحلے میں جن امور کا خیال رکھنا ہوگا انہیں اجمالاً اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ نئی تحریکِ اصلاح کو ابتداء سے ہی ان اصطلاحات کے استعمال میں محتاط رہنا چاہئے جن کے پیچھے ایک ثقافتی تاریخ ہے۔ مثلاً Reformation یا Enlightenment جیسے الفاظ نہ صرف عام ذہنوں میں ان کوششوں کے سلسلے میں کنفیوژن پیدا کرسکتے ہیں بلکہ خود تحریک اصلاح ان اصطلاحات کے تاریخی اور تہذیبی بوجھ سے متاثر ہوسکتی ہے۔ مغرب میں ریفارمیشن کے پیچھے چرچ کے جبر و ظلم کی جو تاریخ رہی ہے اور جس طرح عیسائیت نے انسانی عقل پر صدیوں تالے لگائے رکھنے کی کامیاب کوشش کی، جبر کی یہ صورتحال مسلم ثقافت کے بدترین ادوار میں بھی نہیں ملتی۔ احبار اسلام اور جابر حکمرانوں کے مقابلے میں اہل عزیمت کے فکری و عملی عروج کو بڑی حد تک مسلمہ اعتبار حاصل رہا ہے۔ لہذا جو لوگ آج اسلام میں کسی Luther یا Calvin کے ظہور کی تمنا کرتے ہیں وہ مسلم تاریخ سے ناواقفیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ کچھ یہی حال Enlightenment کی اصطلاح کا ہے جسے فی نفسہ ان معنوں میں تو قبول کیا جاسکتا ہے کہ انسانی عقل کسی چیز کو قبول کرنے سے پہلے اسے ہر طرح لازماً پرکھے البتہ مغرب کے Enlightenment کے تجربے کو شاید ہی کوئی سلیم الفکر شخص عہد جدید میں دہرانا چاہے گا۔ ایسا اس لئے کہ جیسا کہ جرمن فلاسفر Max Horkheimer اور Theodor Adorno کا کہنا ہے Enlightenment سے جہاں بہت سے فوائد حاصل ہوئے وہیں Holocaust بھی اسی تحریک کا ایک فال آؤٹ ہے۔ بقول ازایہ برلن Enlightenment نے صرف Holocaust پیدا نہیں کیا بلکہ کمیونزم کا جبر، گلاگ بھی اسی کا منطقی نتیجہ ہے۔ بات کچھ یہیں ختم نہیں ہوجاتی۔ اٹھارہویں صدی میں عقل پر غیر معمولی انحصار کا نتیجہ یہ نکلا کہ Jefferson ،Kant اور Hume جیسے اصحاب دانش بھی اس خیال کے اسیر ہوگئے کہ سفید فام اقوام کے مقابلے میں دوسری قومیں کم تر ہیں جنہیں تہذیب شناسی کی ضرورت ہے۔ اسی طرح Enlightenment جو ابتداء میں دانش انسانی کا نقیب بن کر سامنے آیا تھا فی الواقع سفید فام اقوام کے جبر و استیلاء کا اعلامیہ بن کر رہ گیا ہے۔ نئے مصلحین اسلام کے لئے لازم ہوگا کہ وہ Enlightenment یا Reformation جیسی value-loaded اصطلاحوں سے یکسر اجتناب کریں۔

۲۔ اس میں شبہ نہیں کہ لوتھر کی تحریکِ اصلاح جس نے عیسائی دنیا کو ایک فجر جدید کا مژدہ سنایا تھا اس کا بنیادی ہدف یہ تھا کہ چرچ کے مقابلے میں scripture کو حکم کے طور پر تسلیم کیا جائے۔ اس طرح Mandate of Humans کے مقابلے میں Mandate of God کی بالا دستی یقیناً ایک انقلاب انگیز خیال تھا جس سے عیسائیت کے علاوہ دوسرے مذاہب کی اصلاحی تحریکیں بھی اگر غذا حاصل کریں تو اسے تحسین کی نظر سے ہی دیکھا جانا چاہئے۔ البتہ مصلحین اسلام کے ذہن میں یہ فرق واضح رہے کہ عیسائیت میں scripture کی جو حیثیت ہے، قرآن کا مقام اس سے کہیں اعلیٰ وارفع ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ قرآن دوسرے صحف سماوی کے معنوں میں scripture ہے ہی نہیں لہٰذا اس کی تشریح وتعبیر باندازِ scripture نہیں کی جاسکتی۔ یہاں ایک ایک لفظ متعین، معروف، محفوظ اور منزل من اللہ ہے جس میں مرتبین یا مترجمین کی دخل اندازی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۳۔ عرصے سے حکمائے اسلام نے عقل اور وحی کو ایک دوسرے کی ضد سمجھ رکھا ہے۔ یہ خیال عام ہے کہ علوم عقلیہ اور نقلیہ الگ الگ ماخذ سے غذا حاصل کرتے ہیں۔ ایک کی بناء مشاہدے اور دوسرے کی بناء وجدان پر ہے۔ مسلم متکلمین مشاہدے کے مقابلے میں وجدانی علوم کے تفوق کے قائل رہے ہیں۔ اس لئے ان کے یہاں مشاہداتی علوم کے سلسلے میں ایک طرح کی بے توقیری کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن مجید، جو مسلمانوں میں وجدانی علوم کا بنیادی ماخذ ہے، تدبر وتفکر اور مشاہدے کی بھرپور وکالت کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وجدان کی عمارت تعقل کی بنیادوں پر رکھی جائے۔ بھلا جو وجدان عقل کو قائل نہ کرسکے یا جو دانش انسانی کی پہنچ سے باہر ہو اسے انسانوں کے لئے مشعل راہ کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟ قرآن فی نفسہ ایک rational discourse ہے جس کا اسلوب مفتیانہ یا dogmatic نہیں بلکہ reflective ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ خدا کی وحدانیت، انبیاء و رسل کی حقانیت اور دین کے طریقۂ نجات ہونے کو بغیر کسی rational discourse کے قبول کرلیا جائے۔ اگر ایسا مطلوب ہوتا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ توحید ورسالت کی بنیادی دعوت کو باسالیب مختلف ساڑھے چھ ہزار سے زائد آیتوں میں بار بار بیان کرنے کی ضرورت پیش آتی۔

انسانی عقل کی بھی یہ کیسی آزمائش ہے کہ اپنی تمام تر تنگ دامانی کے باوجود اس پر کائنات کی ماہیئت کے ادراک اور خالق کے عرفان کا فریضہ عائد کیا گیا ہے۔ انسان انسان جو ٹھہرا، وہ عرفان ذات اور عرفان حق کے مختلف مراحل میں یقیناً غلطیاں کرے گا پھر اپنی غلطیوں سے سیکھے گا بھی۔ اندیشوں اور امکانات کے مابین اسے اختیار کی آزادی دے کر خدا خود یہ چاہتا ہے کہ انسانی عقل وحی سے اکتساب فیض کرتے ہوئے اپنی جولانیاں دکھائے۔ لہٰذا صرف اس اندیشے کے پیش

نظر کہ عہدِ جدید کے مصلحین حساس امور پر زبان کھولنے میں غلطیوں کا ارتکاب کر سکتے ہیں انسانی عقل پر پابندیاں نہیں لگائی جاسکتیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ عقل و آگہی کو ایک دوسرے کی ضد سمجھنے کے بجائے ایک دوسرے کا رفیق و مددگار قرار دیا جائے۔ قدیم اسلامی تعبیرات کو ایسے منجمد عقائد (dogma) کی حیثیت سے نہ دیکھا جائے جسے negotiate نہ کیا جاسکتا ہو۔ یہ کام خاصا آسان ہوجائے گا اگر ہم اس حقیقت کو تسلیم کرلیں کہ ہمارے متقدمین جنہوں نے ماضی میں تشریح و تعبیر کا فریضہ انجام دیا ہے وہ بھی ہماری طرح انسان تھے جن سے لغزشوں اور التباسات کا صدور فطری ہے۔ہم اس بات کے ہرگز سزاوار نہیں کہ دوسروں کے التباسات کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے پھریں۔ ہمارے لئے ہمارے اپنے التباسات کا بوجھ ہی کیا کم ہے۔

۴۔ تقلید اور اصلاح ایک ساتھ نہیں چل سکتے اور نہ ہی تقلید اور تنویر (Enlightenment) کا اجتماع ممکن ہے۔ دانش انسانی کے استعمال میں سابقین کے تجربات سے ہم کسب فیض تو ضرور کر سکتے ہیں البتہ اس بات پر اصرار نہیں کر سکتے کہ اس عمل میں ہمارے اور ان کے نتائج یکساں ہوں۔ اگر نتائج کی یکسانیت کو ہدف قرار دے دیا جائے تو غور وفکر کا سارا سلسلہ لایعنی قرار پاتا ہے۔ البتہ ہمیں اس بات کا التزام کرنا ہوگا کہ غور وفکر کے نئے مراحل میں تقویٰ شعاری کا دامن ہمارے ہاتھوں سے نہ چھوٹنے پائے۔قرآن مجید کے مطالعے میں دانش انسانی کے ساتھ ساتھ تقویٰ شعاری کی نگہبانی بھی لازم ہوگی۔ اور یہ بھی ممکن ہے جب ہم علوم عقلیہ اور نقلیہ کو ایک دوسرے کا حریف تصور کرنے کے بجائے اس کے باہمی تعاون سے ایک ایسی روشنی کی تخلیق کرسکیں جسے reflective knowledge کہا جاسکتا ہے، جو Enlightenment کے بجائے Buddhist bodhi سے کہیں زیادہ قریب ہے۔ reflective knowledge میں نہ تو dogmatic fixity یا مفتیانہ انجماد پایا جاسکتا ہے اور نہ ہی وہ بے سمتی جو Enlightenment کی لازمی منزل post-modernism سے عبارت ہے۔

۵۔ ماضی میں مصلحین اسلام کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے بعض امور کو تحقیق و تجزیے سے بالاتر قرار دے رکھا تھا جس پر کسی گفتگو کا دروازہ کھولنا ممنوع سمجھا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر اتحاد امت کے تمام علمبردار اپنے اپنے فقہی دائرۂ کار کے اندر ہی فکری و عملی سرگرمیوں کو روا سمجھتے تھے۔ ائمہ فقہا اور ائمہ محدثین کی عقل و دانش اور ان کے علمی کاموں کو منزل من اللہ کا درجہ حاصل تھا۔ بعض مصلحین مثلاً شاہ ولی اللہ جیسے علماء تو اس خیال کی بھی پرزور وکالت کرتے تھے کہ مسالک اربعہ کا تعین من جانب اللہ فیصلہ ہے جس میں متقدمین کو تائید ایزدی حاصل رہی ہے۔ فی نفسہ یہ کچھ اسی قسم کی بات تھی

جس کا اظہار عیسائی علماء مروجہ بائبل میں پال کی تحریروں کے سلسلے میں اسے Holy Spirit کا مرہون منت بتاتے اور اسے من جانب اللہ تصور کرتے ہیں۔ نئے مصلحین کے لیے لازم ہوگا کہ وہ آخری رسول پر آنے والی وحی کے علاوہ کسی عام انسان کے الہام یا اس کو حاصل ہونے والی مفروضہ تائید ایزدی کو قطعی اہمیت نہ دیں۔ جب تک انسانی تعبیرات اور اس کے تعمیر کردہ مسالک کی بنیادیں نہیں ہلتیں حقیقی اسلام کی طرف ہماری واپسی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

٦۔ آخری رسول کے متبعین کی حیثیت سے ہم سیادت عالم کے منصب پر فائز کئے گئے ہیں۔ اس عظیم فریضے کی ادائیگی کے لئے لازم ہے کہ ہم آفاقی طرز فکر کے حامل ہوں۔ افسوس کہ ہم صدیوں سے امت مسلمہ کے بجائے امت محمدیہ کی نفسیات میں محصور شب و روز قومِ مسلم کے عروج کے لئے فکرمند اور سرگرداں ہیں۔ ہمارے اس isolationist رویے نے ہماری نظری اور نفسیاتی ہیئتِ ترکیبی کو بری طرح مسخ کر دیا ہے۔ رحمۃ للعالمین کے متبعین نہ جانے کن مفروضہ روایتوں کے زیر اثر آج اس خیال کے اسیر ہیں کہ جس رسول کو رحمۃ للعالمینی کے منصب پر فائز کیا گیا تھا وہ خود دنیا سے اس حالت میں رخصت ہوا کہ اس کی زبان پر صرف امتی امتی کا لفظ جاری تھا۔ کلمۃ سواء کی قرآنی بنیاد نئے مصلحین سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ سکڑتی دنیا میں مختلف ادیان کے مابین ہونے والے مکالمے اور مباحثے کو بھی پیمبرانہ رخ دینے کی جدوجہد کریں۔ دائرۂ امت سے باہر دنیا کو امن وسکون سے آشنا کرنے کے لیے جو کوششیں ہو رہی ہیں ان سے ہم خود کو الگ نہیں رکھ سکتے۔

٧۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اسلام کی چودہ صدیوں پر محیط تہذیبی ورثے پر بلاخوف لومۃ لائم تنقیدی نگاہ ڈالیں۔ خدا کے کلام اور رسولؐ کی سنت کے علاوہ ہمارے لئے کوئی چیز تحلیل و تجزیے اور محاکمے سے بالاتر نہیں ہونی چاہئے۔ اس سرزمین پر کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس پر زباں بندی کو غایتِ دین سمجھا جائے یا جسے سیکورٹی زون قرار دے کر وہاں کسی مناقشے کو داخل ہونے سے روکا جائے۔ وحیِ ربانی کی روشنی میں جب تک ہم اپنی پوری تاریخ کا تنقیدی محاکمہ نہیں کرتے ہمیں اس بات کا واقعی اندازہ نہیں ہوسکتا کہ پانی مرتا کہاں ہے۔

٨۔ نئے مصلحین کو اس بات کا التزام بھی کرنا ہوگا کہ وہ وحی ربانی کے مقابلے میں صدیوں کے متوارث عمل کو، خواہ اس پر مفروضہ اجماع کی مہر کیوں نہ لگ گئی ہو، از سر نو تحلیل و تجزیے کا موضوع بنائیں۔ اب یہ کہنے سے کام نہیں چلے گا کہ کسی مخصوص مسئلے پر فلاں فلاں فقہا اور ائمہ کی کتابوں میں یوں لکھا ہے یا یہ کہ فلاں مسئلہ پر امت کا اجماع ہو چکا ہے جسے از سر نو بحث کی میز پر نہیں لایا جاسکتا۔ خدا کے علاوہ انسانوں کے کسی گروہ کو اس بات کا اختیار نہیں دیا جاسکتا کہ وہ اجماع کا دھونس دے کر یا اہل حل وعقد کے حوالے سے ہمیں کسی مسئلہ پر تحلیل و تجزیے سے باز رکھے۔ یہ رویہ قرآن کے rational

discourse کے خلاف ہے۔ جب اللہ تعالیٰ خود توحید کے بنیادی اعتقادات کو ہمیں عقلی استدلال کے ذریعہ باور کرانا چاہتا ہے اور جب قرآن اپنے ماننے والوں سے اس بات کا طالب ہے کہ وہ تحقیق و تجزیہ کے ذریعہ اشیا کی ماہیئت تک پہونچنے کی کوشش کریں تو پھر عام انسانوں کو یہ حق کیسے دیا جاسکتا ہے کہ وہ اکثریت کے حوالے سے یاو جدنا آباء نا کذلك يفعلون کے سہارے ہمیں کسی مسئلہ کو طے شدہ یا closed for discussion باور کرائیں۔ نئے مصلحین پر لازم ہوگا کہ وہ نصِ قرآنی یعنی شرع اور مدون شریعت جیسا کہ وہ فقہ میں جلوہ گر ہوئی ہے، کے مابین امتیاز قائم کریں۔ اگر قرآن کی طرح فقہاء کے دواوین کو بھی یکساں تقدس عطا کر دیا گیا، جیسا کہ ماضی میں مصلحین کرتے رہے ہیں، تو پھر کسی نئی ابتدا کا امکان ختم ہو جائے گا۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں مکالمے اور مباحثے کی روایت دم توڑ چکی ہو اور جہاں صداقت dogmatic fixity سے عبارت ہو، نئے مصلحین کے لئے ایک نئے طرز فکر کی تعمیر یا ہمہ گیر discourse کی ابتدا کچھ آسان نہیں کہ ایسا کرنا بند معاشرے سے کھلے معاشرے میں داخل ہونے کے مترادف ہوگا۔ اتنی بڑی ابتدا یقیناً کچھ آسان نہیں لیکن اس کے علاوہ اب ہمارے پاس کوئی دوسرا متبادل ہے بھی نہیں۔

عباسی عہد میں مسلم شناخت اور مسلم عقائد پر جو بحثیں چلی ہیں اس کے زیر اثر ہمارے فقہاء مسلمان بنے رہنے کے لئے ان ظواہر کو بھی مسلم شناخت کا حصہ قرار دے بیٹھے تھے جن کا تعلق اسلام کے آفاقی پیغام سے کہیں زیادہ عرب ثقافت سے تھا۔ جب تک مسلم ریاست بغداد، اسپین، ترکی اور ہندوستان میں جس شکل میں بھی باقی رہی علماء نے کیتھولک چرچ کی طرح اس بات کا پورا التزام کیا کہ خدا کی کتاب کے وہی مطالب و معانی سمجھے اور سمجھائے جائیں جو انہوں نے سمجھا ہے۔ خدا کی کتاب پر انسانوں کے ایک مخصوص گروہ کو تشریح و تعبیر کا کامل اختیار مل جانے سے عملاً یہ ہوا کہ عام انسانوں کا وحی ربانی سے براہ راست تعلق باقی نہ رہا۔ رفعِ فتنہ کی خاطر علماء کا یہ قدم خود ایک بڑا فتنہ بن کر رہ گیا۔

اسلام کو نئے شارحین کی ضرورت

عمرانہ قضیہ پر دارالعلوم دیوبند کے فتویٰ اوراس پر مسلم پرسنل لا بورڈ کی توثیق نے کم ازکم اس بات کی وضاحت تو کر ہی دی ہے کہ ہماری دینی درسگاہیں صرف حالاتِ حاضرہ سے ہی بے خبر نہیں بلکہ قرآن فہمی سے بھی نابلد ہیں۔ قرآن مجید کی جس آیت پر اس فتویٰ کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ بڑی سیدھی، صاف اور تمام الجھاؤ سے مبرا ہے۔ ﴿لاتنکحوا مانکح آباء کم﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپوں نے نکاح کیا ہو۔ گویا کسی مرحلہ میں اگر کوئی عورت کسی کے باپ کی بیوی رہی ہے تو آگے چل کر خواہ طلاق کی صورت میں یا باپ کے مرنے کے بعد بیٹے کے لئے جائز نہیں کہ وہ ان عورتوں سے رشتۂ نکاح استوار کرنے کی سوچے۔ جو شخص بھی ذہنی تحفظات سے بالاتر ہو کر اس آیت کو پڑھے گا اس کے حاشیۂ خیال میں بھی فقہاء کی وہ قیل وقال نہیں آئے گی جس کے نتیجے میں آج عمرانہ کے مسئلہ پر مختلف اور متضاد آراء کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

موجودہ صورتِ حال نے اہل فکر مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اسلام کا مستقبل ان روایتی علماء اور ان دینی اداروں کے ہاتھوں محفوظ ہے یا نہیں؟ ہندوستانی مسلمان اپنے دین کے سلسلے میں ہمیشہ سے حساس اور محتاط واقع ہوئے ہیں۔ انہوں نے اس ملک میں دین وشریعت کے نام پر بڑی بڑی تحریکیں چلائیں اور قربانیاں دی ہیں۔ وہ اب تک یہ سمجھتے رہے ہیں کہ دینی مدارس اسلام کے قلعے ہیں لہٰذا اسے ہر بیرونی مداخلت سے محفوظ رکھنے کو انہوں نے دین کی حفاظت پر مبنی سمجھا ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ ان دینی اداروں کے ذریعے اسلام کی جو تشریح وتعبیر سامنے آ رہی ہے وہ سراسر عقل اور قرآن کے خلاف ہے۔ اگر اسلام کو انہی روایتی علماء کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا تو خطرہ ہے کہ وہ فقہاء یہود کی طرح اسے ایک پیچیدہ فن میں تبدیل کر دیں گے اور عام انسانیت کے لئے اسلام میں کوئی کشش باقی نہیں رہ جائے گی۔

اسلام میں کسی ایسے طبقۂ علماء یا مذہبی گروہ کو جواز نہیں بخشا گیا ہے جسے دینی یا روحانی پیشوائی کے منصب پر فائز کیا گیا ہو۔ علماء کرام اس بات سے خوب واقف ہیں کہ ﴿فاسئلوا اھل الذکر﴾ کے حوالے سے انہوں نے اپنے آپ کو مذہبی پیشوائی کے جس منصب پر متمکن کیا ہوا ہے اس کا جواز قرآن کی مذکورہ آیت سے نہیں نکلتا۔ لیکن افسوس کہ وہ اس آیت کے اصل مفہوم سے

کتمان کرتے ہوئے اسے مسلسل اپنی دینی پیشوائی کے لئے استعمال کررہے ہیں۔جن علماء نے عمرانہ کو اپنے شوہر پر حرام ہونے کا فتویٰ صادر کیا ہے اور جس کے لئے انہوں نے فتاویٰ ہندیہ، ردالمختار اور بحرالرائق جیسی کتابوں سے دلیل لانے کی ضرورت محسوس کی ہے، کیا بہتر ہوتا ہے کہ حلال وحرام کے فیصلے کے لئے انسانوں کی لکھی کتابوں پر انحصار کرنے کے بجائے وہ خدا کی کتاب کی طرف رجوع کرتے اور آیت مذکور کو اس کے پورے سیاق وسباق میں پڑھتے کہ اگر ایسا ہوا ہوتا تو فقہاء احناف کی آراء کی غلطی ان پر واضح ہوجاتی۔ یہ تو رہی فقہی معلومات کی بات۔اگر ان حضرات نے معلومات کے علاوہ عقل ودماغ کا استعمال بھی کیا ہوتا تو یہ بات بآسانی ان کے سمجھ میں آتی کہ جو کتاب ہر شخص کو اس کے کئے کا برابر پھل دینا چاہتی ہے جہاں ﴿کل نفس بما کسبت رهينة﴾ اور ﴿ولاتزر وازرة وزر اخرى﴾ جیسی آیات بار بار اس حقیقت کو ذہن نشین کراتی ہوں کہ ہر شخص صرف اپنے عمل کا ذمہ دار ہے وہاں یہ بات کیسے قابلِ قبول ہوسکتی ہے کہ باپ کے گناہ کی سزا بیٹے کو دی جائے اور وہ بھی اس طرح کہ اس کی عائلی زندگی تباہ ہوجائے۔فقہاء کا یہ کہنا کہ اپنے خسر سے زنا کے بعد عورت اپنے شوہر کے لئے مثل ماں ہوگئی ہے دراصل وہ قانونی اور فقہی موشگافیاں ہیں جس کے لئے فقہاء یہود معروف ہیں۔لیکن افسوس کہ ہم نے فقہاء یہود کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اب علماء یہود کی طرح ہمارے علماء بھی وحی ربانی پر راست غور وفکر کے بجائے اس بات کو کافی سمجھتے ہیں کہ کسی مسئلہ پر قدیم فقہاء نے کیا لکھا ہے۔ بھلا جو لوگ پکے حنفی ہوں ان کے لئے فقہاء احناف کی رائے سے انحراف کیسے ممکن ہے؟ ہاں یہ ممکن ہے کہ وہ قرآن کے نظامِ انصاف اور قرآنی آیت کے سیدھے سادھے مطلب سے صرف اس لئے صرفِ نظر کرلیں کہ علماء احناف نے اس کا مطلب کچھ اور سمجھا ہے۔

رہے معتدل علماء تو عام طور پر ان کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ جب فقہی موشگافیاں اور قدیم آراء ہماری راہ میں حائل ہوجاتی ہیں تو وہ اس سے نکلنے کے لئے شافعی، مالکی یا حنبلی فقہ کا سہارا لیتے ہیں۔خدا کی کتاب کا سہارا لینے کی جرأت سے وہ بھی خالی ہیں۔عمرانہ کے مسئلہ پر بعض معتدل علماء نے مسلکِ شافعی کے مطابق رائے دینے کی کوشش کی ہے اور باور کرایا ہے کہ کوئی حرام فعل کسی حلال کو فاسد نہیں کرسکتا۔لہٰذا خسر کے ذریعہ زنا کا شکار بننے والی عورت کا رشتہ اس کے شوہر سے برقرار رہے گا۔ بظاہر اس رائے میں عقل واعتدال کا استعمال معلوم ہوتا ہے البتہ یہ رویہ بھی قرآن مجید کی روشنی میں اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے کے بجائے آراء الرجال سے ہی غذا حاصل کرتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ امت مسلمہ کا تمام تر انحراف اور اس کے زوال کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم نے قرآن مجید کے ارد گرد تاویلات کا حصار کھڑا کررکھا ہے۔ہم کسی مسئلے پر قرآن مجید کو بولنے ہی نہیں دیتے۔اس کے برعکس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مسئلہ مذکورہ پر ہمارے مکتبۂ فکر کے فقہاء نے کیا لکھا ہے۔رہے وہ مسائل جن کا بیان ان کتب میں نہیں پایا جاتا تو ہم ہر نئی چیز کی اس وقت تک

مزاحمت کرتے ہیں جب تک وہ رائج ہو کر ہمیں خود اپنے حصار میں لے لے۔ لاؤڈ اسپیکر کے استعمال سے لے کر مشینی ذبیحے تک ہمارے علماء نے پہلے تو ہر چیز کو حرام قرار دیا پھر رفتہ رفتہ وہی حرام اتنا پسندیدہ ہو گیا کہ اب مائک کے بغیر کوئی مولوی تقریر کرنا پسند نہیں کرتا۔ حق تو یہ ہے کہ حلال وحرام کا اختیار اللہ نے انسانوں کو دیا ہی نہیں ہے۔ تمام حلال اور تمام حرام قرآن میں بیان کر دئے گئے ہیں۔ اس لئے ہمیں یہ بات ذہن سے نکال پھینکنی ہوگی کہ اسلام کی تشریح وتعبیر کا حق کسی خاص طبقہ کو حاصل ہے۔ سچ پوچھئے تو اسلام خدا اور بندے کے درمیان براجمان ہونے والے اسی طبقۂ احبار کے انہدام کے لئے آیا ہے۔ دنیا میں تمام نبی یہی دعوت لے کر آئے کہ وہ بندوں کا راست تعلق اس کے رب سے قائم کریں۔ کسی چرچ یا مولویت کے کسی ادارے کو بیچ میں حائل ہونے کا موقع نہ ملے۔ خدا کی کتاب کو چھوڑ کر حرام وحلال کے فیصلے کے لئے علماء کرام کی طرف دیکھنا یا قدیم فقہاء کی کتابوں میں ان کے اقوال تلاش کرنا انتہائی ناپسندیدہ عمل ہے جسے قرآن ﴿اتخذوا احبارھم و رھبانھم اربابا من دون اللہ﴾ سے تعبیر کرتا ہے۔

اہلِ فکر مسلمانوں کو یہ بات سمجھنی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی پر قرآن مجید نازل فرمایا تھا فقہاء اربعہ کے دواوین نہیں۔ قدیم فقہاء بھی ہم جیسے انسان تھے جن سے غلطیوں کا صدور عین ممکن ہے۔ ہم اس بات کے سزاوار نہیں کہ ان کی غلطیوں کو اپنے کمزور کاندھے پر اٹھائے پھریں۔ ہمارے لئے ہمارے اپنے التباسات فکری ہی کیا کم ہیں۔ پھر کسی مسئلہ پر صرف چار فقہاء کی کتابوں کو ہی کیوں دیکھا جاتا ہے۔ ابوحنیفہ سے ابن حنبل تک کم از کم انتالیس ایسے ائمہ کا تذکرہ تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہے جو ہم پایہ علمی مرتبہ کے لوگ تھے اور جن میں سے بیشتر کی کتابیں زمانہ کی نذر ہو گئیں اور جن کے زیاں سے یقیناً اسلام کے فہم کو کوئی نقص نہیں پہونچا۔ پھر کیا ان چار ائمہ کے بغیر آج اس امت کا فہمِ قرآن ناقص رہ جائے گا؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب اہل فکر مسلمانوں کو دینا ہے۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ ائمہ اربعہ کا نزول من جانب اللہ نہیں ہوا تھا اور نہ ہی قرآن ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ہم آخری رسول کے بعد کسی اور شخص کو اپنے لئے کلی طور پر لائق اتباع قرار دیدیں۔ جو لوگ مسلم پرسنل لا بورڈ یا دیوبند کے دارالافتاء سے اس بات کے شاکی ہیں کہ وہ عمرانہ قضیہ پر عقل وانصاف کی روشنی میں گفتگو نہیں کر رہے ہیں اور جنہیں اس بات کی شکایت ہے کہ ہماری روایتی دینی درسگاہیں جو قرآن مجید کو سمجھنے سمجھانے کے لئے قائم ہوئی ہیں قرآن سے راست اکتساب کی اپنے اندر ہمت نہیں پاتیں، انہیں یہ سمجھنا چاہئے کہ ان حضرات کی جس طرح ذہنی تربیت ہوئی ہے اس میں قرآن مجید کا وہ مقام ہے ہی نہیں جس کی ہم ان سے توقع کئے بیٹھے ہیں۔ مدارس کے نصاب پر ایک نظر ڈالئے اور خود ہی فیصلہ کیجئے کہ وہاں قرآن کتنے گھنٹے پڑھایا جاتا ہے اور اس کا کتنا حصہ نصاب میں شامل ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ دوسرے علوم بھی فہم قرآن میں معاونت کے لئے پڑھائے جاتے ہیں لیکن اگر یہ دعویٰ صحیح ہے اور قدیم سماجی عمرانی علوم اگر قرآن فہمی میں ہماری معاونت کر سکتے ہیں تو جدید عمرانی مطالعات کو اس نصاب سے خارج رکھنے پر قدیم علماء کا اصرار کیوں ہے؟

عمرانہ کو انصاف روایتی علماء کے فقہی قیل وقال کے ذریعہ مل سکے گا یا ملکی نظام کے اندر وہ انصاف کا کہیں زیادہ امکان پائے گی؟ اس سے کہیں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس مسئلہ نے مفتیان کرام کی اہلیت اور علماء کی قرآن فہمی پر جو سوالیہ نشان لگایا ہے یہ داغ کیسے دھل سکے گا۔ جو لوگ حنفی فقہ کے مطابق عمرانہ سے اس کے خسر کے جرم کی پاداش میں اس کا شوہر چھین لینا چاہتے ہیں اور جو فقہ کی اس تعبیر کو شریعت الٰہی بتا کر اسے مسلمانوں کے پرسنل لا کے حقوق سے جوڑتے ہیں وہ زانی خسر کو صرف اس وجہ سے ملکی نظام قضاء کے سپرد کرنے پر مطمئن ہیں کہ یہاں چونکہ اسلامی قانون نافذ نہیں اس لئے اس کے خسر کو سنگسار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کیسی عجیب تاویل ہے کہ ایک فریق کے اوپر شریعت نافذ کرنے پر تو آپ اتنا اصرار کریں کہ اسے دین وایمان کا مسئلہ بنادیں اور دوسرے فریق کو صرف اس لئے شریعت سے رہائی مل جائے کہ یہاں اسلامی قانون نافذ نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ جس طرح عمرانہ کا نکاح غیر قرآنی بنیادوں پر فسخ کرنے کی مہم چلائی جارہی ہے اسی طرح محصن زانی کے لئے سنگساری کی سزا بھی قرآن پر ایک بہتان ہے کہ سورہ نور میں زانی کی اصل سزا دُرّے مارنا بتائی گئی ہے۔لیکن جو لوگ فقہا کی قیل وقال کو قرآن سے زیادہ اہمیت دیتے ہوں وہ اس مفروضہ پر اصرار کرنے سے باز نہیں آئیں گے کہ آیتِ رجم قرآن میں موجود تھی جو کھو گئی یا اٹھالی گئی البتہ اس کا حکم باقی ہے۔ افسوس کہ ایسا کہنے والوں کو اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ کس شقیق القلبی کے ساتھ عصمتِ قرآن پر حملہ کررہے ہیں۔

جب تک اہل فکر مسلمان اس بات کی کوئی منظّم کوشش نہیں کرتے کہ دین مبین کی تشریح وتعبیر کا حق کچے پکے مفتیوں اور نیم خواندہ مولویوں سے لے لیا جائے، کسی طبقۂ علماء پر انحصار کے بجائے مسلمان قرآن مجید پر انحصار کرے اور عام لوگوں کے دل ودماغ میں یہ بات ذہن نشیں ہوجائے کہ اسلام میں کسی طبقۂ علماء یا روحانی پیشوائی کی کوئی مذہبی حیثیت نہیں ہے، اس وقت تک اغیار کے لئے ممکن رہے گا کہ وہ اسلام کی مضحکہ خیز تصویر پیش کرتے رہیں۔ ہندوستان کے پچیس کروڑ مسلمانوں کو اب یہ احساس ہوجانا چاہئے کہ دین کی حفاظت کے لئے خانقاہ ومدرسہ پر انحصار مناسب نہیں اب خود انہیں آگے بڑھ کر خدا کی کتاب کو تھام لینا ہوگا۔

عباسی بغداد کا فنونِ لطیفہ، مسلم اسپین کا سائنسی عروج، اور مغل سلطنت کے تاج محل یا لال قلعہ کے لافانی نقوش، جن کو مسلمان اپنی تہذیبی تاریخ کے سنگ میل کے طور پر پیش کرتے ہیں دراصل ہم ان تمام کاموں کیلیئے مامور ہی نہیں کئے گئے تھے۔ قومی افتخار کی ان تمام علامتوں کا کارِ نبوت سے کچھ بھی علاقہ نہیں۔

مابعد جمہوریت اور اسلام

ہم بہت تیزی کے ساتھ ایک ایسے عہد میں داخل ہورہے ہیں جسے غالباً مابعد جمہوریت کا نام دینا مناسب ہو۔کل تک جن انسانی اقدار کو ہمارے معاشرے میں قبولیت عامہ حاصل تھی آج وہ مسلسل زوال پذیر ہیں۔اکرام انسانیت،حریت فکر وعمل اور ایک دوسرے کا باہمی احترام جس سے کسی مہذب معاشرہ کی شناخت قائم ہوتی ہے آج زبردست خطرے میں ہے۔غور وفکر اور اظہار خیال کی آزادی،ایسا محسوس ہوتا ہے اب سلب ہوجائے گی اور یہ سب کچھ مشرق سے کہیں زیادہ مغرب میں ہورہا ہے جسے جدید جمہوریت کے گہوارے کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

گیارہ ستمبر کے وقوعہ نے تہذیبوں کے مابین تصادم کو ہوا نہیں دی ہے جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ کے بعد حریت فکری اور بند دماغی انسانیت اور فاشسزم کے مابین جاری معرکہ آرائی اب فیصلہ کن مرحلہ میں داخل ہوگئی ہے۔جو لوگ مغرب کی معاصر تاریخ پر نگاہ رکھتے ہیں اور جو گزشتہ ربع صدی میں پیش آنے والی سماجی اور سیاسی تبدیلیوں سے واقف ہیں وہ یقیناً اس احساس سے خالی نہیں ہوں گے کہ گیارہ ستمبر سے بہت پہلے بلکہ سویت یونین کے زوال کے بعد ہی،مغربی دنیا آہستہ آہستہ Liberal Pluralism سے Evangelical Democracy کی طرف سفر کررہی تھی۔بالفاظ دیگر یہ کہہ لیجئے کہ مغرب میں جمہوریت کے نام پر چند دولتمند ہاتھوں میں اقتدار کا جو ارتکاز ہوا تھا وہ رفتہ رفتہ ایک ایسے نظام کی داغ بیل رہا تھا جس کی صحیح تعریف کے لئے سچ تو یہ ہے کہ ابھی تک الفاظ وضع نہیں ہوئے ہیں اور اسی لئے ہم اسے مابعد جمہوریت سے تعبیر کرنے پر مجبور ہیں۔گو کہ امریکی معاشرے میں جمہوری اقدار کی فروخت کی بات اب بھی جاری ہے اور آج بھی امریکی خارجہ پالیسی کا بنیادی ہدف دنیا کے مختلف حصوں میں جمہوری نظام کی توسیع اور اس کا استحکام بتایا جاتا ہے۔لیکن ان بلند بانگ دعووں کے علی الرغم اب اس حقیقت سے پردہ اٹھ چکا ہے کہ امریکی پالیسی ساز جمہوریت کا فروغ تو کجا خود دنیا کی دوسری جمہوریتوں کو انگیز کرنے کے لئے تیار نہیں۔اگر ایک طرف جمہوری اقدار ہم سے اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ ہم آزاد ریاستوں کی خود مختاری کا احترام کریں اور ان معاشروں میں رہنے والے لوگوں کو ان کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی جینے کا حق دیں تو دوسری طرف

Evangelical Democracy کے علمبردار یہ چاہتے ہیں کہ ساری دنیا پر امریکی طرز زندگی کی حکمرانی قائم ہوجائے۔ گویا آج فروغ جمہوریت کے نام پر امریکہ کی قیادت میں جو جنگ لڑی جا رہی ہے وہ ایک عالمی نظام استبداد کے قیام کی جنگ ہے۔ یہ گویا اس بات کی بہیمانہ کوشش ہے کہ پوری دنیا اب صرف کوکوکولا اور میگ برگر کے تہذیبی شکنجوں میں کس دی جائے۔

جمہوریت ہے کیا شئے؟ دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف اقوام وملل کے لئے اس سوال کے جواب مختلف ہوسکتے ہیں۔ جمہوریت کی کوئی ایک ایسی تعریف جس کے صحیح ہونے پر اصرار کیا جائے دراصل جمہوریت کی بنیادی روح کے منافی ہوگی۔ انسانوں کے کسی ایک طبقہ کو یہ حق کیسے دیا جاسکتا ہے کہ وہ تمام انسانوں کے لئے زندگی جینے کا کوئی حتمی طریقہ متعین کردے۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو اسے جمہوریت نہیں بلکہ فاشسزم کہا جائے گا۔ اگر امریکہ کا جمہوری معاشرہ اس بات کی ضرورت سمجھتا ہے کہ مجرموں کو سزائے موت جیسی انتہا پسند سزائیں دی جائیں تو اس کے لئے اس بات کا کیا اخلاقی جواز ہے کہ وہ فرانسیسی حکومت کے اس فیصلہ کی مخالفت کرے جس کے مطابق ریاستی اسکولوں میں اسکارف یا دوسری مذہبی علامتوں کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا ہے اور نہ ہی اس کے پاس اس بات کے لئے کوئی اخلاقی جواز ہے کہ وہ مسلم حکومتوں سے اس بات کا مطالبہ کرے کہ یہ حکومتیں اپنی تہذیبی اور مذہبی اقدار کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ہم جنس پرستوں کو قانونی اقلیت تسلیم کرلیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جمہوریت کی تنگ نظر اور جامد تعبیر نے جس کا اظہار بار بار مغربی دارالحکومتوں سے ہوتا رہا ہے روحِ جمہوریت کو بری طرح زخمی کردیا ہے۔ اب تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ جمہوریت سیاسی اور سماجی تبدیلی کا ایک پرامن طریقہ ہے جسے انسانوں نے صدیوں کے تہذیبی سفر میں دریافت کیا ہے لیکن اب مغربی جمہوریت کے سلسلے میں یہ خام خیالی ختم ہورہی ہے۔ اب جمہوریت نام ہے دو برائیوں میں سے کمتر برائی کے انتخاب کا۔ اور صرف مغرب میں نہیں بلکہ جہاں جہاں جمہوری معاشرہ مستحکم ہوا ہے وہاں کچھ ایسی ہی صورتحال پیدا ہوگئی ہے۔ اہل نگاہ واقف ہیں کہ امریکہ اور برطانیہ کے حالیہ انتخابات میں عوام کے لئے گندے انڈوں اور سڑے ٹماٹروں میں سے ہی کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ بش اور کیری، ٹوری اور لیبر کوئی بھی عوام کی پسندیدہ ترجیحات میں شامل نہیں تھے۔ مہذب جمہوری معاشروں میں جب عوام کی امنگوں اوران کی آرزوؤں کے مطابق متبادل مفقود ہوجائے اور انہیں اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ ناپسندیدہ عناصر میں سے ہی کسی ایک کو منتخب کریں تو یہ انتخابات انسانی معاشرے کو آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کی طرف لے جائیں گے اور یہ صورت حال اس دنیا کو رفتہ رفتہ صالح اور امن پسند انسانوں کے لئے ایک قید خانہ میں تبدیل کردے گا۔ صاف محسوس ہورہا ہے کہ آج سویت یونین کی عقوبت گاہیں اور نازی جرمنی کے تعذیبی مراکز گونت ناموبے جیسے بے شمار Detention Facility کی شکل میں پرانی بہیمیت کو نئے نام سے زندہ کررہی ہیں۔

اس خطرے کے پیش نظر فطری طور پر ہمارے ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ کیا ماضی کی طرح ایک بار پھر روحِ جمہوریت کو

اپنے دشمنوں پر سرخروئی حاصل ہوسکے گی؟ اس سوال کا جواب اثبات میں دینا کچھ آسان نہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ مابعد جمہوریت جس صورتِ حال سے عبارت ہے وہاں اس بارے میں خاصا ابہام پایا جاتا ہے کہ معاشرے میں قوت کے واقعی مآخذ کہاں پائے جاتے ہیں۔ بسا اوقات تو یہ کہنا مشکل ہوتا ہے کہ سرمایہ داری کا یہ پورا متحرک نظام کہاں سے کنٹرول کیا جارہا ہے۔ بظاہر دیکھنے والوں کو یہ محسوس ہوسکتا ہے کہ امریکی استعمار دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اپنے فوجی اڈوں اور تعذیبی مراکز کے ذریعے اس دنیا کو اپنے شکنجے میں کسے ہوئے ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس استبدادی نظام کے اندر کچھ ایسے نامحسوس اور پراسرار ہاتھ بھی ہیں جن پر اب کسی ریاست کا واقعی کنٹرول نہیں رہ گیا ہے۔ ملٹی نیشنل تجارتی کمپنیاں، بین الاقوامی نوعیت کی رفاہی تنظیمیں، بے پناہ وسائل رکھنے والے ٹرسٹ اور تہذیبی ادارے، غیر معمولی سرمایہ کی حامل مالیاتی تنظیمیں اور میڈیا چینل جو چند افراد کی ملکیت ہیں استبدادی نظام کے اندر غیر محسوس طور پر اپنا رول انجام دیتی ہیں۔ سرمایہ داروں کے اس چنگل میں موجودہ دنیا کچھ اس طرح پھنس کر رہ گئی ہے کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک نئی تبدیلی کے لئے آغاز کہاں سے کیا جائے۔ اس صورتحال نے نہ صرف یہ کہ مغربی جمہوریت کو ایک اندھی گلی میں پہونچادیا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ فرد جو مدتوں سے جمہوریت کا خوگر تھا اب اپنے آپ کو ایک نظری اور فکری خلا سے دوچار پاتا ہے۔

مابعد جمہوریت کے عہد نے ہمیں ایک ایسی مایوسی سے دوچار کردیا ہے جس کی نظیر ان لوگوں کے بیانات میں بھی نہیں ملتی جو کبھی تاریخ کے خاتمے کی پیش گوئی کیا کرتے تھے، کہ کل تک جو لوگ جمہوریت کی فتح کے بعد تاریخ کے خاتمے کا بگل بجارہے تھے ان کے ذہنوں میں یہ بات کہیں نہ کہیں ضرور موجود تھی کہ تاریخ اپنے سفر کے خاتمے کے بعد دوبارہ اسی دائرے میں متحرک ہوسکتی ہے۔ اس کے برعکس موجودہ صورت حال ہمیں یہ احساس دلاتی ہے کہ جمہوریت کے خاتمے اور اس کی ناکامی کے بعد اب انسانوں کے پاس کوئی نظریہ بچا ہی نہیں ہے۔ یہ احساس شدید تر ہوتا جارہا ہے کہ تاریخ بے سمتی کا شکار ہوگئی ہے اور ہم مستقبل سے بے خبر ایک نامعلوم منزل کی طرف سفر کرنے پر مجبور ہیں۔ مستقبل کے سلسلے میں اس بے یقینی نے ہم میں سے بہتوں کو یہ سوچنے پر مجبور کیا ہے کہ اے کاش! اس چلتی پھرتی بے سمت گردش کرتی ہوئی دنیا سے ہم خود کو علیحدہ کرسکتے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس دنیا سے اتر کر جائیں تو کہاں جائیں کہ کوئی دوسری متبادل دنیا موجود بھی تو نہیں۔ ان سرمایہ دارانہ کمپنیوں نے ذرائع ابلاغ کو بھی اپنا غلام بنا رکھا ہے مثال کے طور پر جنرل الیکٹرک کمپنی کو لیجیے جس کی ملکیت NBC, CNBC, MSNBC جیسی میڈیا کمپنی ہیں۔ اسی طرح CNN ٹائم وارنر کی ملکیت، ABC ڈزنی کی ملکیت اور CBS وائیکوم کی ملکیت ہے۔ سرمایہ داروں کے میڈیا چینل ہمیں وہی کچھ دکھاتے ہیں جو ان کی اپنی آرزوؤں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ انہیں اندازہ ہے کہ اگر عام انسانوں کو اصل صورت حال کا ادراک ہوگیا تو دنیا پر ان کی موجودہ اجارہ داری باقی نہیں رہ سکے گی۔

یہ ہے وہ مایوس کن صورتِ حال جس سے ہم دو چار ہیں۔ بظاہر تو اس بات کا کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا کہ اس مستحکم استبدادی نظام کے خاتمہ کے لئے کوئی موثر تحریک مستقبل قریب میں اٹھ سکے گی۔ رہی مغرب میں چلنے والی امن کی تحریکیں یا انسانی حقوق کی انجمنیں جو اس صورت حال پر وقتاً فوقتاً واویلا مچاتی رہتی ہیں تو ان سے کسی بنیادی تبدیلی کی امید اس لئے نہیں کی جاسکتی کہ یہ تمام تحریکیں دراصل اسی سرمایہ دارانہ نظام کا توسیعہ ہیں جو اپنی مالی امداد کے لئے انہی سرمایہ دارانہ مالیاتی اداروں اور اوقاف پر انحصار کرتی ہیں۔ استبدادی نظام انہیں اسی وقت تک انگیز کرے گا جب تک کہ ان انجمنوں کی چلت پھرت سے نظام سرمایہ داری کو واقعی کوئی خطرہ نہ ہو۔ جو لوگ آج مغرب کی سڑکوں پر جنگ اور ماحولیات کی تباہی کے خلاف نعرے بلند کررہے ہیں ہم ان کے اقدامات کو مستحسن تو ضرور سمجھتے ہیں البتہ ان سے کسی بنیادی یا انقلابی تبدیلی کی امید نہیں لگاتے۔ یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ مغرب میں بار بار ایسا ہوا ہے کہ جب یہ انجمنیں نظام سرمایہ داری کے لئے خطرہ بننے لگی ہیں استبدادی نظام نے فوری طور پر ایسے اقدامات کئے ہیں جس نے ان انجمنوں کی چیخ و پکار کو فی الفور بے اثر کردیا ہے۔ مثال کے طور پر اکتوبر 2000 میں کوئی پچاس امریکی غیر سرکاری انجمنوں، جن میں مشہور زمانہ تنظیم ایمنسٹی انٹرنیشنل اور ہیومن رائٹس واچ بھی شامل تھیں، نے اقوام متحدہ سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ امریکی ریاست کو اس بات کا پابند کرے کہ شہریوں کے مابین ترجیحات اور ناانصافی کے خاتمے کو یقینی بنائے۔ گیارہ ستمبر کے واقعہ سے چند دن قبل ڈربن میں اقوام متحدہ نے نسل پرستی کے خلاف ایک اجلاس منعقد کیا تھا جس میں بہت سی غیر سرکاری تنظیموں نے ایک قرارداد کی حمایت میں آزاد منڈی کی معیشت کو بنیادی طور پر ایک ناقص نظام بتایا تھا گویا امریکی سرمایہ دارانہ نظام خود اپنے اندرون میں پلنے والی رفاہی انجمنوں کی زد پر تھا لیکن اس کا انجام کیا ہوا۔ گیارہ ستمبر کی آڑ میں دہشت گردی کے خلاف جنگ کا جو بگل بجایا گیا اس میں یہ ساری باتیں دب گئیں۔ دہشت گردی کے حوالے سے اظہار خیال پر اتنی پابندیاں عائد کردی گئیں کہ اس قسم کی تنقید اور ان مسائل پر کسی مباحثے کا سرے سے امکان ہی ختم ہو گیا۔

مسئلہ یہ ہے کہ اب کیا کیا جائے؟ جمہوریت کی موت کے بعد اب ہمارے لئے اس کے علاوہ اور کیا چارۂ کار رہ جاتا ہے کہ ہم دوسرے متبادل نظام کی تلاش تیز تر کردیں۔ فی الفور کوئی ایسا متبادل موجود نہیں ہے جو اس جاری نظام کی جگہ لے سکے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ خدا کی کتاب آج بھی ہمارے درمیان موجود ہے لیکن ہم صدیوں سے اسے جزدان میں لپیٹ کر رکھنے اور اس سے برکت حاصل کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ عام مسلمانوں کے علاوہ اس سرزمین پر دوسرے مذہبی گروہ بھی موجود ہیں، وہ لوگ بھی ہیں جنہیں حضرت مسیح نے 'زمین کا نمک' اور 'پہاڑی کا چراغ' قرار دیا تھا اور وہ لوگ بھی جو آل یعقوب پر ہونے والے انعام واکرام کے حوالے سے آج بھی خود کو خدا کا لاڈلا سمجھتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ نہ اب ان پہاڑی کے چراغوں میں کوئی روشنی رہی اور نہ ہی خدا کی لاڈلی قوم سمجھنے والوں کے پاس دنیائے انسانیت کے لئے کوئی منصوبہ ہے۔ عرصہ ہوا اہل یہود کی مذہبی فکر صرف

اپنی فلاح و بقا کے گرد گردش کرتی ہے۔ یہ لوگ صرف اپنی نجات کی فکر میں لگے ہیں۔ دوسری طرف عیسائیت اپنی تاریخ میں اتنے نظری حوادث سے دوچار ہوئی ہے کہ اس کی تاریخ نظری مصالحت کی داستان بن کر رہ گئی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے انبیاء کے باقیات ہیں جو کسی نہ کسی شکل میں آج بھی ایک پرامن مستقبل کی امید میں اپنے اپنے دائروں میں متحرک ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان تمام گروہوں کو اس بات کا احساس دلایا جائے کہ ہم آج جس بحران سے دوچار ہیں وہ عالمی نوعیت کا ہے۔ استبدادی نظام کا شکنجہ بڑا سخت اور مضبوط ہے اس سے نجات کے لئے جب تک مشترکہ جدوجہد کا ڈول نہیں ڈالا جاتا کامیابی ممکن نہیں۔

جو لوگ صدیوں سے اس طرز فکر کے اسیر رہے ہوں کہ ایک نئی دنیا کی تعمیر میں وہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو ساتھ نہیں لے سکتے، ان کے لئے کسی مشترکہ جدوجہد کا ڈول ڈالنا کچھ آسان نہ ہوگا اور نہ ہی دوسری قوموں کے لئے یہ ممکن ہو سکے گا کہ وہ کسی داعی گروہ کو جس کا مذہب مختلف ہو خیر کے کام میں کھلے دل سے اپنا تعاون دیں۔ گویا ایک مشترکہ جدوجہد کے لئے نظری بنیادوں کی تلاش کا کام اساسی اہمیت رکھتا ہے۔ محمد رسول اللہ کے سچے وارثین کی حیثیت سے ہم مسلمانوں پر یہ لازم آتا ہے کہ ہم ان نظری بنیادوں کو از سر نو اجاگر کریں جو ہمیں یہ بتاتی ہیں کہ ہم خیر کے کام میں دوسری حلیف قوموں کا تعاون کس طرح حاصل کریں۔ قرآن کی نظر میں یہ بات کلمۃ سواء ہو سکتی ہے ایک مشترکہ ایجنڈا جو تمام انسانوں کی فلاح کا ضامن ہو۔ قرآن کی یہ نظری اساس غیر اقوام کے لئے دوبارہ باعث کشش ہو سکتی ہے جب انہیں یقین ہو جائے کہ محمد رسول اللہ کے متبعین ساری دنیا کو استبدادی نظام سے نجات دلانے کے لئے میدان میں آئے ہیں۔ وہ اسلام کے نام پر قوم مسلم کی حکمرانی کا خواب نہیں دیکھ رہے ہیں۔ بدقسمتی سے ماضی میں ایسا ہوا ہے کہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں نے نظری انقلابات کو قومی سلطنتوں کے استحکام میں استعمال کیا ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ لہذا آج اگر متبعین محمدؐ کو ایک عالمی تحریک نجات کی قیادت سنبھالنی ہے تو انہیں عام انسانوں پر یہ بات واضح کرنی ہوگی کہ وہ سرمایہ دارانہ استبداد کے خاتمے کے بعد ایک ایسے قرآنی معاشرہ کی تشکیل کا منصوبہ رکھتے ہیں جہاں تمام ہی انسانوں کو پھلنے پھولنے کے یکساں مواقع میسر آئیں گے۔ کسی سے ناانصافی نہیں کی جائے گی اور نہ ہی کسی کو ایسا محسوس ہوگا کہ وہ لسانی، نسلی، تہذیبی اور جغرافیائی نسبت کی وجہ سے نئی تہذیب کے حاشیے پر رہ گیا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ایک ایسے آفاقی پروگرام میں متبعین محمدؐ کو دوسرے مذاہب کی سعید روحوں کا تعاون نہ مل سکے۔

ہم اس حقیقت سے صرف نظر نہیں کر سکتے کہ آج ہم جس دنیا میں رہ رہے ہیں وہ ماضی سے کہیں مختلف ہے۔ ٹیکنالوجی نے دنیا کو اتنا مختصر کر دیا ہے کہ اب یہاں کسی ایک گروہ کا دوسروں سے الگ تھلگ رہنا ممکن نہیں۔ نئی دنیا ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ ایک آفاقی نظریہ کی طالب ہے۔ لہذا جو لوگ جدید دنیا کی قیادت کی بات سوچتے ہوں انہیں پہلے اس بات کا التزام کرنا ہوگا آیا ان کا نظری ڈھانچہ ایک پیمبرانہ لب و لہجہ کا حامل ہے یا نہیں۔ ایک ایسا لب و لہجہ جو پوری دنیائے انسانیت سے خطاب کرتا ہو۔

آیئے ذرا اس نکتے کا تفصیلی بیان کیا جائے۔ عام ذہنوں میں اسلام کا جو تصور راسخ ہے وہ بالعموم دو عناصر کا مجموعہ ہے۔ اولاً وہ پیغام جو خدا نے اپنے آخری پیغمبر محمد رسول اللہ پر بذریعۂ وحی اتارا، ثانیاً وہ سماجی اور سیاسی تاریخ جو اسلام کے پیروکاروں نے گزشتہ صدیوں میں وضع کیا۔ گویا اسلام کے نام پر ہمارے ذہنوں میں صرف محمد رسول اللہ کی طرف بھیجا جانے والا پیغام ہی نہیں آتا بلکہ مسلمانوں کی تاریخ بھی اس میں شامل ہو جاتی ہے۔ آج اس مروجہ اور متوارث اسلام میں جسے ہم مسلم تاریخ اور مسلم تہذیب کے نام سے جانتے ہیں بہت سی ایسی چیزیں شامل ہیں جن کا تعلق عربوں، ترکوں، مغلوں اور دوسری اقوام کی اپنی مخصوص تہذیب سے ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ صدیوں کے تعاون میں یہ چیزیں مسلم شناخت کا جز بن گئی ہیں۔ اسلام کی آفاقیت میں ان ثقافتی عوامل کے شامل ہو جانے سے ہوا یہ ہے کہ آج دوسری اقوام اس ثقافت میں خود کو اجنبی محسوس کرتی ہیں۔ انہیں ایسا لگتا ہے گویا مسلمانوں کی تہذیبی ثقافت بھی اس آفاقی دین کا ایک جز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج مغربی اقوام اسلام کو بالعموم ایک عرب مذہب کے طور پر دیکھتی ہیں۔ وہ محمد رسول اللہ کو صرف عالم عرب کا پیغمبر سمجھتیں ہیں۔ اسلام کے نام سے ان کے ذہنوں میں ایک ایسے مذہب کا تصور ابھرتا ہے جو مشرق وسطیٰ کے لوگوں کے لئے مخصوص ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کا آفاقی پیغام کسی ایسے خیال کی توثیق نہیں کرتا۔ البتہ ماضی میں ہمارے فقہاء نے دنیا کو دارالاسلام اور دارالکفر کے خانوں میں جس طرح سمجھنے کی کوشش کی اس سے یہی تاثر پیدا ہوتا تھا کہ اسلام کو عربیت سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ آج جہاں کہیں بھی احیائے اسلام کی بات ہوتی ہے عام ذہن یہ سمجھتا ہے کہ مسلمان ایک بار پھر اپنے غلبہ کا پلان بنا رہے ہیں۔ اسلام کے سلسلے میں اس قسم کی غلط فہمیوں کو رفع کئے بغیر ہم غیر مسلم اقوام کو عالمی انقلاب کے پروگرام میں شامل نہیں کر سکتے۔ ہمیں اس غلط فہمی کو ختم کرنا ہوگا کہ مستقبل میں غلبہ اسلام کی تحریک قومی مسلمانوں کے سیاسی یا ثقافتی غلبے پر منتج ہوگی۔ ہمیں یہ بتانا ہوگا کہ اسلام ایک ایسی دنیا کے قیام کا علمبردار ہے جہاں تمام ہی انسان رنگ و نسل کے امتیاز کے بغیر مشترکہ طور پر خدائے واحد کی توحید کا نغمہ گا سکیں جہاں نہ کوئی قوم غالب ہو اور نہ مغلوب۔ یہی اسلام کی دعوت کا لب لباب ہے اور یہی ہے وہ توحید خالص جس کا اسلام داعی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ سکڑتی دنیا نے ایک ایسے آفاقی اسلام کے ظہور کی راہ ہموار کر دی ہے۔

قرآن رہتی دنیا کے لئے کتاب ہدایت ہے اس کی معنویت جتنی کل تھی اتنی ہی آج بھی ہے۔ یہ جس طرح عربوں کو خطاب کرتا ہے اسی طرح غیر عرب اقوام بھی اس کے مخاطب ہیں۔ کسی قوم کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ قرآن چونکہ اس کی زبان یا اس کی سرزمین میں نازل ہوا ہے اس لئے خدائی اسکیم میں اسے وہبی طور پر کوئی امتیازی مقام حاصل ہے۔ اور نہ ہی غیر عرب اقوام کو اس غلط فہمی کا شکار ہونا چاہئے کہ مستقبل کے خدائی منصوبے میں ان کا مقدر اس مشن کے حاشیے پر رہنا ہے۔ مسلم اہل فکر پر یہ بات واضح ہونی چاہئے کہ عباسی عہد میں مسلم شناخت اور مسلم عقائد پر جو بحثیں چلی ہیں اس کے زیر اثر ہمارے فقہاء مسلمان بنے رہنے

کے لئے ان ظواہر کو بھی مسلم شناخت کا حصہ قرار دے بیٹھے تھے جن کا تعلق اسلام کے آفاقی پیغام سے کہیں زیادہ عرب ثقافت سے تھا۔ پھر آنے والے دنوں میں چونکہ رفع فتنے کی خاطر بحث کا دروازہ بند کر دیا گیا اور یہ سمجھا جانے لگا کہ باب اجتہاد بند ہے۔ اس لئے راسخ العقیدہ علماء نے اس بات کا خاص اہتمام کیا کہ ابتدائی عہد کی طرح عقائد کی بحثیں دوبارہ سر نہ اٹھائیں خواہ ایسا کرنے کے لئے انہیں قرآن مجید سے راست اکتساب کا دروازہ کیوں نہ بند کرنا پڑے۔ جب تک مسلم ریاست بغداد، اسپین، ترکی اور ہندوستان میں جس شکل میں بھی باقی رہی علماء نے کیتھولک چرچ کی طرح اس بات کا پورا التزام کیا کہ خدا کی کتاب کے وہی مطالب و معانی سمجھے اور سمجھائے جائیں جو انہوں نے سمجھا ہے۔ خدا کی کتاب پر انسانوں کے ایک مخصوص گروہ کو تشریح و تعبیر کا کامل اختیار مل جانے سے عملاً یہ ہوا کہ عام انسانوں کا وحی ربانی سے براہ راست تعلق باقی نہ رہا۔ رفعِ فتنہ کی خاطر علماء کا یہ قدم خود ایک بڑا فتنہ بن کر رہ گیا۔ قرآن کی آفاقیت انسانی تعبیرات کی تنگ نظری میں مقید ہو کر رہ گئی۔ یہ وہ صورت حال تھی جس نے آخری نبی کے متبعین کو مسلم قومی حصار میں قید کر ڈالا جس کے نتیجے میں انہیں اقوام عالم کی سیادت سے کنارہ کشی اختیار کرنا پڑی۔

جیسا کہ ہم نے بتایا کہ دنیائے انسانیت کی موجودہ بے کسی اور بے سمتی ہم سے یہ مطالبہ کر رہی ہے کہ ہم قرآن مجید کے اس آفاقی پیغام کو مسلم قومی ورثہ سے نکال کر دنیائے انسانیت کے مشترکہ چارٹر کے طور پر پیش کریں۔ ہمارے خیال میں ماضی کے مقابلے میں کلمۃ سواء کی بنیاد پر انسانوں کی عمومی نجات کا امکان آج کہیں زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو سکڑتی دنیا میں اقوام عالم کے مابین گہرے رابطوں کی بحالی ہے جس میں انٹرنیٹ ایک اہم رول انجام دے رہا ہے اور دوسری وجہ خود مسلم معاشروں میں پائی جانے والی وہ عمومی فکرمندی اور بیداری ہے جس نے اہل فکر مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کیا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ احیاء اسلام کی پرشور تحریکوں اور بے شمار قربانیوں کے باوجود ہماری دوبارہ تنصیب امامت کا کام ابھی باقی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم جس تہذیبی اسلام کی پرزور دعوت دیتے رہے ہیں اس کی جڑیں ہماری تہذیبی تاریخ میں ہیں قرآن مجید میں نہیں۔ اور یہ کہ کسی ثقافتی اسلام میں دوسری اقوام کے لئے کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہوسکتی۔ جو لوگ دنیا کو موجودہ بے سمتی سے نجات دلانے کے خواہاں ہیں انہیں سب سے پہلے تو اپنا نظری محاکمہ کرنا ہوگا آخر کیا وجہ ہے کہ ہماری اسلامی سرگرمیوں میں اب پیمبرانہ وسعت اور آفاقیت کا فقدان ہے جو تمام اقوام کے دکھے دلوں پر مرہم رکھتی اور ان کی نجات کا مژدہ سناتی ہے۔ وقت آگیا ہے کہ ہم پیمبرانہ اسلام اور تاریخی اسلام میں فرق کو محسوس کریں۔ اگر مسلمان فی زمانہ پیمبرانہ لب ولہجہ کی تشکیل میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو یہ معاصر تاریخ کا اتنا بڑا واقعہ ہوگا جس سے ایک دنیا جنم لے سکتی ہے۔

ہمیں اس بات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ گذشتہ چند صدیوں میں اسلام کا فکری سرمایہ مدافعت کی زبان میں کیوں لکھا گیا ہے، آخر کیا وجہ ہے کہ جو لوگ نظری طور پر دنیا کی قیادت کے لئے اٹھائے گئے تھے اور جنہیں آخری نبی کے متبعین کی حیثیت سے رحمت للعالمینی کا فریضہ انجام دینا تھا وہ خود کو اقوام عالم کے مقابلے میں ایک فریق کی حیثیت سے اس قدر دیکھنے کے عادی ہوئے کہ ان کی نفسیات پر مدافعت پوری طرح غالب آ گئی، تحریک دعوت یا تحریک رحمت کے حاملین تحریک مزاحمت کے ذہنی سانچے سے جب تک نہیں نکلتے ان کے لئے قرآن کے آفاقی پیغام سے فائدہ اٹھانا اور اسے بروئے کار لانا کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟

تقلیبِ فکر ونظر کی دعوت

سعودی دارالحکومت ریاض کے مضافات میں جدید طرز کی قلعہ نما عمارتوں پر مشتمل ایک وسیع وعریض کیمپس واقع ہے۔ جامعۃ الامام کا یہ کیمپس جہاں دینی تعلیم وتربیت کا اعلیٰ سطح پر اہتمام پایا جاتا ہے اپنی نوعیت کا واحد ادارہ نہیں۔ مدینہ منورہ میں جامعہ اسلامیہ، مصر کا شہرۂ آفاق مدرسہ از ہر شریف اور اس قبیل کی نہ جانے کتنی دینی درسگاہیں دنیا بھر میں علوم شرعی کے حوالے سے معروف ہیں۔ ریاض شہر کی دوسری جانب کنگ سعود یونیورسٹی کا وسیع وعریض کیمپس ہے جسے سیکولر یا عصری تعلیم کے حوالے سے عالم عرب میں ایک ممتاز مقام کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ جامعہ امام اور جامعہ سعود گو کہ ایک ہی شہر میں واقع ہیں لیکن ان دونوں کی دنیا مختلف ہے۔ ایک کے یہاں صرف علوم شرعی پر زور ہے، دوسرے علوم اس کی نظر میں لائق اعتنا نہیں تو دوسری طرف عصری علوم کے حاملین علوم شرعی کو اپنے فکر ونظر کے دائرے سے خارج سمجھتے ہیں۔ علم کی یہ اسلامی اور غیر اسلامی تقسیم مسلم دنیا میں صدیوں سے رائج ہے۔ اب یہ روایت اتنی مستحکم ہوگئی ہے کہ کوئی جبیں اس ثنویت پر شکن آلود نہیں ہوتی اور نہ ہی کسی کو اس خیال کی اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔

مسلمانوں کے فکری زوال کا ایک بڑا سبب علم کے سلسلے میں ان کا اپنا پیدا کردہ التباس ہے۔ جو لوگ معاصر دانش گاہوں میں تعلیم پاتے یا درس وتدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں وہ صدیوں سے اس احساس تلے جیتے ہیں کہ وہ علوم شرعی کے حاملین کے مقابلے میں کمتر درجے کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ دوسری طرف روایتی دانش گاہوں میں علماء وشیوخ اس التباس فکری کے شکار ہیں کہ وہ وارثین انبیاء اور طالبان نبوت ہیں، علم کی حقیقی خدمت صرف وہی انجام دے رہے ہیں اور ان ہی کے حوالے سے آخرت کی فلاح ونجات کا فیصلہ ہونا ہے۔

مسلمانوں میں علم شرعی کی روایت جس کا سلسلہ صدیوں سے چلا آتا ہے دراصل ان کے دورِ زوال کی پیداوار ہے۔ استعمار سے پہلے جہاں بھی جس شکل میں بھی مسلم حکومتیں باقی رہیں، مسلمانوں کی درسگاہیں علم کی اس شرعی اور غیر شرعی تقسیم سے نا آشنا تھیں۔ اس بات کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ روایتی درس گاہوں کے نصاب میں آج بھی ان علوم وفنون کے باقیات

کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں جو اپنے وقت میں عصری علوم کی ترقی یافتہ شکل سمجھے جاتے تھے۔ منطق وفلسفہ، ریاضی اور علم ہیئت، علم کلام اور عروض و بلاغت جیسے مضامین جو آج اپنی موجودہ شکل میں از کارِ رفتہ معلوم ہوتے ہیں اپنے عہد میں عصری آگہی سے واقفیت کی دلیل سمجھے جاتے تھے۔ البتہ جب سے مسلم اہلِ فکر نے یہ سمجھ لیا کہ ان دانش گاہوں کا کام اب محض دین کی حفاظت ہے اقوام عالم کی قیادت وسیادت کا زمانہ جاچکا تب سے علم شرعی کے حاملین خالصتاً مدافعت کی نفسیات کے اسیر ہوگئے۔ فکر ونظر کا یہ زوال چند برسوں کی بات نہیں بلکہ اس کی جڑیں دور بہت دور ماضی بعید میں پائی جاتی ہیں۔

دینی مدارس جو علم شرعی کے حوالے سے اپنی دینی حیثیت پر استدلال کرتے ہیں ان کے پیشِ نظر اگر صرف یہ مقصد ہو کہ وہ مسلم معاشرے کے لئے واعظ وخطیب، امام اور قراء پیدا کریں گے جس کی بہرحال مسلم معاشرے کو ضرورت ہے تو محض اس ہدف کو حاصل کرنے کے لئے اتنے بڑے پیمانے پر متخصصین کی دانش گاہیں قائم کرنے کی ضرورت نہ ہوگی کہ یہ ہدف مختصر عرصے میں جز وقتی نصاب کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ البتہ اگر ان کا مقصد ایسے علما ومفکرین پیدا کرنا ہے جو جدید دنیا کی فکری وعملی قیادت کرسکیں تو یہ کام یقیناً ان دانش گاہوں سے نہیں ہوسکتا جہاں قدامت کو جز ونصاب سمجھا گیا ہے اور جہاں طلباء واساتذہ کو اس بات کی ہوا بھی نہیں لگنے دی جاتی کہ نئی دنیا میں اقوام وملل کے سامنے اس وقت کون سا ایجنڈا معرض بحث ہے۔

علم کیا ہے؟ الراسخون فی العلم کون لوگ ہوسکتے ہیں؟ قرآن مجید عالم کی کیا تعریف متعین کرتا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا صحیح جواب فراہم کئے بغیر ہم اس ثنویت کا پردہ چاک نہیں کرسکتے جو علم کے سلسلے میں ہمارے یہاں رائج ہوگئی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے ﴿هل يستوى الذين يعلمون والذين لا يعلمون﴾ (الزمر:۹)۔ قرآن کی نگاہ میں علم کے دو مآخذ ہیں: وحی اور عقل۔ وحی وہ شاہِ کلید ہے جس سے اگر صرف نظر کیا جائے تو عقلِ بے مہار گمرہی کی طرف لے جاسکتی ہے۔ اس کے برعکس وحی کی روشنی میں عقل کا سفر انسان کو حقیقت کی نقاب کشائی کا متحمل بناتا ہے۔ وہ لوگ جو آیت اللہ پر غور وفکر کے ذریعہ خالق کا عرفان حاصل کرسکیں اور جن کے قلوب اس کی خشیت اور جاہ جلال سے مبہوت ہوجائیں وہی لوگ ہیں جنہیں صحیح معنوں میں عالم کہا جاسکتا ہے۔ ﴿انما يخشى الله من عباده العلمٓؤا﴾ (فاطر:۲۸)۔ قرآن مجید کے نزدیک رسول کا فریضہ یہ ہے کہ وہ خدا کی آیات کی تلاوت کے ذریعے انسانوں کے قلب ونظر کی تشکیل کرتا اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ کتاب کے ساتھ حکمت کا بیان اور خود رسول کو اس کارِ حکمت پر مامور کرنا اس بات پر دال ہے کہ قرآن جو انسانوں کے لئے شاہ کلید ہے اس کو برتنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے عقلی رویے کی ضرورت ناگزیر ہے۔ دل ودماغ کو متحرک کئے بغیر اس کتاب سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔

حکمت کیا ہے؟ بعض متقدمین کو کتاب کے ساتھ حکمت کے تذکرے سے یہ اشتباہ پیدا ہوا ہے کہ کتاب اگر قرآن ہے تو

حکمت سنت۔لیکن قرآن مجید کی ان تمام آیات کو سامنے رکھنے سے، جہاں مختلف سیاق میں حکمت کا لفظ وارد ہوا ہے، اس خیال کی تصدیق نہیں ہوتی۔اس کے برعکس حکمت کے معنی ایک عقلی رویے کی تشکیل اور دل ودماغ کو متحرک رکھنے سے عبارت ہے۔اس بات کی تائید جابجا آیت حکمت کے مطالعے سے ہوتی ہے جیسا کہ حضرت داؤد کے حوالے سے وارد ہے کہ انہیں اللہ نے اقتدار اور حکمت سے نوازا (بقرہ:۲۵۱)۔اسی سیاق میں آگے ارشاد ہے ﴿یؤتی الحکمة من یشاء و من یؤت الحکمة فقد أوتی خیرا کثیرا﴾ (البقرة:۲۶۹)۔ایک دوسری جگہ آل ابراہیم کے حوالے سے انہیں کتاب وحکمت اور ملک عظیم عطا کرنے کا تذکرہ ہے (نساء:۵۴)۔سورہ نساء میں مسلمانوں کو یہ مشورہ بھی دیا جارہا ہے کہ وہ لوگوں کو دین کی دعوت دینے میں کمال حکمت اور موعظۃ حسنۃ سے کام لیں۔قرآن کی لغت میں حکمت دراصل ایک بہت جامع لفظ ہے۔یہ ایک ایسا ذہنی رویہ ہے جو انسانی دل و دماغ پر وحی کی ضیاپاشیوں سے تشکیل پاتا ہے۔اس کے برعکس خالص تعقل پسندی انسان پر ان امور کی نقاب کشائی نہیں کرسکتی جو وحی کا طرۂ امتیاز ہے۔

عہد رسولؐ کی تہذیبی اور فکری زندگی پر غور کیجئے۔توحید خالص کی دعوت نے اوہام وخرافات میں ڈوبے ہوئے بت پرست معاشرے میں ایک ایسی ہلچل پیدا کردی تھی کہ نفع ونقصان کے میزانیے کو لات ومنات سے وابستہ کرنے کے بجائے خالص عقل کی کسوٹی پر دیکھا جانے لگا۔قرآن اہل کفر کے سلسلے میں بار بار یہ کہتا ہے کہ وہ عقل سے کام نہیں لیتے، صاف روشن حقیقتوں پر غور و فکر نہیں کرتے۔اسی طرح قصۂ ابراہیم میں اس عقلی مکالمے کو ملاحظہ کیجئے جہاں اصنام پرستی کے خلاف یہ دلیل لائی گئی ہے کہ جو بت اپنے نفع ونقصان پر قادر نہیں وہ بھلا دوسروں کو کیا فیض پہونچا سکتے ہیں۔دل اگر حق کا متلاشی ہو تو وہ عقل کے سہارے منزل مراد کو پہنچ سکتا ہے۔یہی ہے کتاب وحکمت کے امتزاج کا ماحصل۔

ابتدائی عہد میں مسلمانوں کی پہلی نسل جس حیرت انگیز طریقے سے اقوام عالم پر اپنی فضیلت قائم کرتی رہی اس کے پیچھے ایک بڑا محرک کتاب وحکمت سے تشکیل پانے والا قلب سلیم تھا۔عہد اولیٰ میں ہمارے علماء ومفکرین کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ ہمارا کام صرف علم شرعی کی تحصیل وتحفیظ تک محدود ہے۔رہی خدا کی کائنات کی تسخیر اور اس میں پائی جانے والی مختلف اقوام وملل کی امامت تو اس دنیاداری سے بھلا علماء کرام کا کیا واسطہ۔بلکہ سچ پوچھئے تو ابتدائی عہد میں تفقہ فی الدین کی بات تو سنائی دیتی ہے البتہ علم کی شرعی اور غیر شرعی تقسیم کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

ابتدائی عہد میں ہمارے لئے یہ خیال بھی اجنبی تھا کہ مسلمانوں میں عامۃ الناس سے الگ، علم دین کے حوالے سے، علماء و مشائخ کا کوئی طبقہ اپنی علیحدہ حیثیت اور فضیلت پر اصرار کرے گا۔آج جو پوری دنیا میں مسلمانوں کے مابین علماء وشیوخ کا ایک طبقہ دیکھنے کو ملتا ہے جس نے اپنے لباس، عادات واطوار اور طریقۂ کلام سے اپنے آپ کو عام مسلمانوں سے ممیّز کررکھا ہے، کسی

ایسے طبقہ کا وجود کم از کم پہلی صدی ہجری کے آخر تک نہیں پایا جاتا۔ علم کے حوالے سے طبقۂ علماء کی باضابطہ تشکیل کا کام عہد عباسی میں انجام پایا۔ قاضی ابو یوسف اسلام میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنے لئے عام لوگوں سے الگ ایک ایسے مخصوص لباس کا تعین کیا جسے عہدۂ قضا کے حوالے سے رفتہ رفتہ طبقہ علما میں قبولیت حاصل ہوگئی اور جسے آج مختلف شکلوں میں، مختلف معاشروں میں علماء اسلام نے اختیار کر رکھا ہے۔ یہی عہد علم کے حوالے سے ائمہ محدثین اور ائمہ فقہاء کے ظہور کا بھی ہے۔ اسی عہد میں قراء کے مقابلے میں محدثین کی سماجی حیثیت بڑھتی گئی اور یہ خیال عام ہوا کہ اصل علم روایتوں کی تجمیع اور تحفیظ سے متعلق ہے۔ اسی عہد میں عالم کی قرآنی تعریف التباس فکری کا شکار ہوئی اور پھر آگے کی صدیوں میں رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک آ پہونچی کہ باقاعدہ علوم کی شرعی اور غیر شرعی تقسیم عمل میں آ گئی۔ غیر شرعی علوم کے سلسلے میں چونکہ یہ خیال عام ہوا کہ وہ دنیاداروں کا میدان ہے اس لئے عام مسلم ذہنوں میں تسخیر کائنات کے سلسلے میں بے توقیری کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس کے برعکس علماء و مشائخ نے آخرت کے حوالے سے معاشرے میں اپنی سماجی توقیر میں خاصا اضافہ کر لیا۔ آگے چل کر جو لوگ تسخیر کائنات کے علوم سے وابستہ رہے یا جنھوں نے مسلم معاشرے میں سائنس و طب کی بیش بہا خدمات انجام دیں وہ بھی ایک طرح کے احساس پشیمانی سے دوچار رہے، انہیں ایسا لگتا تھا جیسے علوم شرعی کے مقابلے میں تسخیر کائنات کے شعبے سے ان کی وابستگی کوئی گھٹیا درجے کا فریضہ ہے۔ اس طرز فکر نے رفتہ رفتہ مسلم معاشرے کو تسخیر کائنات کی قرآنی دعوت سے غافل کر دیا۔ علم کے نام پر اب ہمارا کل سرمایہ علوم نقلیہ تک محدود ہو گیا اور علماء کا یہ وظیفہ قرار پایا کہ وہ متقدمین کی کتابوں سے ان کے فہم دین کو ہم تک منتقل کرتے رہیں۔ بلکہ بعد کے عہد میں تو علماء نے یہ کام بھی اپنے ذمہ لے لیا کہ وہ متقدمین کی تشریح و تعبیر کے علاوہ ہرگز کسی نئی فہم کو اعتبار عطا نہیں کریں گے۔

فی زمانہ علم کے حوالے سے مسلم دنیا جس التباس فکری کی شکار ہے کچھ یہی صورت حال اہل یہود کے ربائیوں نے بھی کوئی دو ہزار سال سے پیدا کر رکھی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ فقہاء یہود کے نزدیک زندگی کا بنیادی وظیفہ توراۃ کا پڑھنا پڑھانا، اس کی تشریح و تعبیر کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ حتیٰ کہ روزی کمانے کے لئے بھی حیلِ شرعی کے ذریعہ یہ راستہ نکالا گیا کہ اس کی اجازت صرف اس شکل میں دی جاسکتی ہے جب کمانے والا اس نیت سے کمائے کہ وہ توراۃ کے طالب علموں پر اپنی کمائی صرف کرنا چاہتا ہو۔ رہا توراۃ کے علاوہ کسی اور کتاب کا مطالعہ تو فقہاء یہود کے نزدیک یہ ایک سنگین جرم تھا۔ معبد کی دوسری تباہی کے بعد اہل یہود کے تمام بڑے دماغ علم شرعی کے سلسلے میں پیدا کردہ اپنے اس مغالطے کے اسیر رہے۔ ایسا نہیں کہ ان کے یہاں دو ہزار سالوں میں بڑے دماغ پیدا نہ ہوئے ہوں لیکن ان کی تمام تر ترکتازیوں کا میدان ربائی ادب کی قیل و قال رہی۔ ان کے بہترین دماغ اس طرح کی شرعی بحثوں میں اپنی قوت ضائع کرتے رہے کہ سبت کے دن کس کس عمل سے اس کی حرمت پامال ہوسکتی ہے۔ حتیٰ کہ یہ بات بھی موضوع بحث بنی کہ خدا ترس یہودی سبت کے دن ٹوائلیٹ فلش کر سکتے ہیں یا نہیں۔ دنیا ان دو ہزار سالوں میں اہل یہود

کے کسی بڑے دماغ سے نا آشنا رہی۔ البتہ جب اٹھارہویں صدی کے آخر میں مشرقی یوروپ میں ان کے بعض فقہاء نے حیلِ شرعی کے سہارے شرعی علوم کے علاوہ دوسری کتابیں پڑھنے کی راہ نکالی تو انیسویں اور بیسویں صدی میں اہل یہود کے خانوادہ سے علماء ومفکرین کا ایک سیلاب سا آ گیا۔

راسخ العقیدہ یہودی جزئیات ورسومات کی بڑی باریک بینی سے پابندی کرتے ہیں۔ حضرت مسیحؑ کے الفاظ میں 'مچھر چھاننے اور اونٹ نگل جانے' کا محاورہ ان پر صادق آتا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے یوروپ میں جب دنیا صنعتی انقلاب کی اتھل پتھل سے دوچار تھی، اہل یہود کے ربائی اپنی قوم کو اس بات کی اجازت دینے کے لئے تیار نہ تھے کہ وہ نئے انقلاب کی ماہیئت اور اس کے اسباب کا مطالعہ کریں۔ مگر انسانی شب وروز میں کچھ لمحات ایسے بھی تو ہوتے ہیں جب توراۃ اور مذہبی کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا جاسکتا۔ مثال کے طور پر بیت الخلا میں جو وقت گزرتا ہے، کیا اس دوران سیکولر علوم کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے؟ بعض یہودی فقہاء نے ایسے اوقات میں دنیوی علوم کے مطالعہ کی اجازت دیدی۔ پھر کیا تھا جسے دیکھئے اس فقہی گنجائش سے فائدہ اٹھانے لگا۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں مشرقی یوروپ کے یہودی گھرانوں میں گھنٹوں بیت الخلا میں وقت گزارنے کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس عہد میں عام طور پر اہل یہود کے اہلِ فکر قبض کی شکایت کرتے نظر آتے ہیں۔

اہلِ یہود کے ہاں اس حیلِ شرعی کے ذریعہ دنیوی علوم پر لگی پابندی کا جو بند ٹوٹا ہے تو پھر یہ سلسلہ روکے نہیں رکا۔ دیکھتے دیکھتے انیسویں اور بیسویں صدی میں قوم یہود سے علماء ومفکرین کی ایک فوج نکل آئی جن کے دل ودماغ نے انیسویں اور بیسویں صدی کی بساط سجانے میں کلیدی رول ادا کیا۔ اہل یہود کے اس تجربہ میں ہم مسلمانوں کے لئے عبرت کا بڑا سامان پوشیدہ ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے یہاں شرعی اور دنیوی علوم کی ثنویت دور کرنے کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں البتہ اب تک ہمارے علماء اس ادراک سے خالی رہے ہیں کہ علم کے سلسلے میں اس التباس نے ہمارے زوال میں کلیدی رول ادا کیا ہے اور یہ کہ اس ثنویت کو دور کئے بغیر ہم سیادت کے راستہ پر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ابوحامد غزالی نے احیاء العلوم میں ایک جگہ لکھا ہے کہ مسلمانوں کو طب، ہندسہ جیسے علوم سیکھنا چاہئے تاکہ وہ غیر مسلموں کے محتاج نہ ہوں۔ البتہ یہ خیال کہ ان علوم کا سیکھنا ہی دراصل علم کی تکمیل سے عبارت ہے ہمارے فکری چوکھٹے میں اب تک پوری طرح نہیں سما سکا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم اہل فکر کتاب وحکمت کے اس امتزاج اور اس کے مضمرات کا کسی حد تک ادراک کریں۔ البتہ جو لوگ عرصے سے علماء یہود کی طرح علم کی شرعی اور غیر شرعی تقسیم کے قائل رہے ہیں ان کے لئے کسی ایسی حقیقت کا ادراک تقلیب فکر ونظر کے بغیر ممکن نہ ہوگا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کے بغیر اور دوسرا کوئی مختصر راستہ ہے بھی نہیں۔

بین الاقوامی کاؤنسل برائے اسلام

دنیا بحران کی زد میں ہے اور اس سے بھی بڑی مصیبت یہ کہ امت مسلمہ جسے ان نازک لمحات میں انسانیت کے نجات دہندہ کی حیثیت سے سامنے آنا چاہئے تھا، اپنے داخلی خلفشار میں گرفتار ہے۔ دنیا کے مرکزی اسٹیج سے امت مسلمہ کے غیاب نے ان لوگوں کو کھلی چھوٹ دے رکھی ہے جنھیں نہ تو کسی آسمانی ہدایت کی ہوا لگی ہے اور نہ ہی انھیں احترامِ آدمیت کا کوئی پاس ہے۔ ہم ایک ایسی خدا بیزار، اخلاق باختہ، بے سمت تہذیب کے شکنجہ میں پھنس گئے ہیں، جس نے عالمگیریت کے نام پر پوری دنیا کو عملاً ایک عالم گیر جہنم میں تبدیل کر دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس سرزمین کے باشندوں پر مستقبل کے سلسلے میں شدید مایوسی اور کنفیوژن کی فضا طاری ہے۔ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ اس بے سمت تہذیب کا اگلا قدم کہاں جا پڑے گا اور اس کے اسرار و عواقب کیا ہوں گے؟

آخری وحی کے حاملین کی حیثیت سے متبعین محمدؐ معاصر تاریخ میں ایک خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ اور اس کے رسولؐ نے یہ ذمہ داری عائد کی ہے کہ وہ مستقبل میں عالم انسانیت کی رہنمائی اور اس کی دادرسی کا فریضہ انجام دیں۔ البتہ اگر آج اس فریضہ منصبی کے باوجود مسلمان تاریخ کے حاشیے پر نظر آتے ہیں تو اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ عرصے سے اپنے بارے میں خودساختہ غلط فہمیوں کے اسیر ہیں۔ اوّلاً بجائے اس کے کہ وہ اپنے آپ کو خیر امت کی حیثیت سے دیکھتے جس پر پوری انسانیت کے مستقبل کا انحصار ہو اور جس کے ذمہ اللہ نے زمین پر عدل کے قیام کا فریضہ عائد کیا ہو، مسلمان صدیوں سے اپنے مسائل میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ اب وہ تمام امور پر خالص قومی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ دوسروں کی بھلائی کے لئے برپا کی جانے والی امت کا حال یہ ہے کہ اس کی نگاہ اپنے قومی امور اور ملّی فلاح و بہبود سے آگے نہیں دیکھ پاتی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں پوری دنیا کی سیادت پر فائز کیا تھا لیکن وہ اپنی پیدا کردہ غلط فہمیوں کے زیر اثر دنیا کو دارالاسلام اور دارالکفر کی فقہی اصطلاحوں میں دیکھنے کے اس حد تک اسیر ہوئے کہ بسا اوقات ایسا محسوس ہوا گویا اس مفروضہ دارالکفر سے اہل اسلام کا کچھ بھی علاقہ نہیں۔ ثانیاً قرآن مجید نے متبعین محمدؐ پر تاریخ کے آخری لمحے تک اقوامِ عالم کی رہنمائی کا جو فریضہ عائد کیا تھا اس میں انبیائے سابقین کی امتوں اور دوسری تہذیبوں میں پائی جانے والی سپرد کردہ نفوس کو فطری حلیف کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ گویا توحید

خالص کی بنیاد پر عدل وانصاف کے قیام میں ہانکے پکارے ہر ایک کو اس کی بساط بھر شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ لیکن افسوس کہ آنے والے دنوں میں قرآن کی یہ وسیع القلبی بعض سیاسی عوامل کے زیر اثر فقہاء کی قیل وقال کی نظر ہوگئی۔ جو لوگ ہمارے فطری حلیف ہو سکتے تھے انھیں حریف کے طور پر دیکھنے کا رواج پیدا ہوا اور مسلمانوں میں اس خیال نے قبولیت حاصل کر لی کہ ہم بھی دوسری امتوں کی طرح بس ایک امت ہیں جن کے لئے اپنی ملی زندگی کی ترتیب وتدوین دیگر اقوام سے الگ رہ کر ہی انجام دینے میں عافیت ہے۔ ثالثاً متبعین محمدؐ مجموعی طور پر اس بات کے سزاوار قرار دیئے گئے تھے کہ وہ وحی کی روشنی میں تاریخ کے آخری لمحے تک اقوام عالم کی قیادت کا فریضہ انجام دیتے رہیں۔ آخری رسولؐ کا تصور فی نفسہ اس بات کا اعلان تھا کہ متبعین محمدؐ کو آپؐ کے غیاب میں کارِ نبوت کا فریضہ انجام دیتے رہنا ہے۔ یہ اتنی بڑی ذمہ داری تھی کہ اس کارِ عظیم کے لئے پوری امت کو ہر لمحہ آنکھیں کھلی اور دل ودماغ کو بیدار رکھنا ضروری تھا۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ تاریخ پر امت کی گرفت ڈھیلی پڑتی۔ لیکن عملاً ہوا یہ کہ قرآن مجید سے اس راست رابطے کا کام امت نے صرف طبقۂ علماء کے ذمہ کر دیا اور وہ خود من حیث الامت راست قرآن مجید پر انحصار کے بجائے علماء پر انحصار کے عادی ہوتے گئے۔ دوسری طرف علماء تصورِ علم کے سلسلے میں اپنے پیدا کردہ التباسات کے زیرِ اثر وحی کی روشنی سے مسلسل دور ہوتے گئے۔ صورتِ حال یہاں تک آ پہنچی کہ قدماء کے اقوال اور ان کی فکری جولانیاں نئے علماء کا مبلغِ علم بنتے گئے۔ آگے چل کر اس صورت حال نے نئے تازہ خیالات کے امکانات ختم کر دیئے۔ پوری امت اس بندر صفتی کی زد میں آ گئی جس کا بیان قرآن مجید میں اہل یہود کے حوالے سے حصولِ عبرت کے لئے آیا ہے: ''وکونوا قردۃ خاسئین''۔ رابعاً اسلام میں طبقۂ علماء کا قیام ایک بڑی بدعت تھی۔ یہ گویا پھر سے دینِ براہیمی میں احبار ورہبان کے ادارے کو زندہ کرنا تھا۔ عوام اس خیال سے مطمئن رہے کہ قندیلِ ربّانی کی حفاظت کا کام علماء نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے، کارِ نبوت کے سلسلے میں وہ چاق وچوبند ہیں اور دوسری طرف علماء اس مغالطے کے اسیر ہوگئے کہ پچھلوں نے غور وفکر کا سارا کام انجام دے ڈالا ہے۔ قرآن مجید سے ساری ہدایات مستخرج ہوکر اب دواوین فقہ میں مدوّن ہو چکی ہیں۔ اب دل ودماغ کو حرکت دینے کے بجائے ان کا کام صرف یہ ہے کہ وہ قدماء کے اقوال سے لوگوں کو باخبر کرتے رہیں۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں قرآن مجید کے راست دخل کو عملاً معطل کر دیا۔ خامساً طبقۂ علماء جنہیں وارثین نبوت کا درجہ حاصل ہوگیا تھا، ان کا اوڑھنا بچھونا قدماء کے اقوال اور ان کے تحریر کردہ حواشی تھے۔ ان کے یہاں علم کا مفہوم انتہائی محدود ہوکر ان کتب تک محدود ہوگیا تھا جو پچھلی صدیوں میں نقلی اور عقلی علوم کے حوالے سے قدماء میں معروف رہے تھے۔ عالم کی قرآنی تعریف کہ کائنات پر غور کرتے ہوئے اس پر خشیت طاری ہو جاتی ہے، سے یہ مروجہ علماء کوسوں دور تھے۔ ﴿فاسئلوا اھل الذکر﴾ کے حوالے سے اہل فتاویٰ نے اپنے لئے جو گنجائش پیدا کر رکھی تھی کسی کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں آتی تھی کہ اس آیت کا سباق دراصل

علمائے اہل یہود ہیں۔ طبقۂ علماء کے قیام اور انہیں دینی اتھارٹی کی حیثیت مل جانے سے گویا اسلام میں ایک طرح کی یہودیت داخل ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیادت عالم پر فائز کی جانے والی امت علم کے حوالے سے ایسی فقہی موشگافیوں کی اسیر ہوگئی جن کی تمام تر جولانیاں چند مسائل تک محدود تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ پر امت کی گرفت ڈھیلی پڑتی گئی۔

امتِ مسلمہ کا زوال صرف مسلمانوں کا قومی نقصان نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ آخری وحی کو منجمد کئے دینے اور اسے اہل یہود کی طرح کتاب برکت میں تبدیل کردینے کی وجہ سے پوری انسانی تاریخ بحران کی زد میں آ گئی ہے۔ گذشتہ چند صدیوں میں دنیا کے مختلف ملکوں میں علوم کی ترقی اور انسانی زندگی کو بہتر بنائے جانے کی تمام تر اسکیمیں وحی سے بے نیاز ہوکر بنائی گئی ہیں۔ اس لئے ہماری ترقیاں مسلسل نئے نئے مسائل کو جنم دینے کا باعث بنی ہیں۔ احترامِ آدمیت کا خاتمہ، پیداوار کی جنونی دوڑ، چند ہاتھوں میں دولت کا ارتکاز، اسلحوں کی عالمی صنعت، ماحولیات کی تباہی اور دنیا کا ایٹمی بھٹی میں تبدیل ہوجانا، یہ وہ صورتحال ہے جس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک ایسی دنیا پر سوار ہیں جس پر ہماری گرفت ڈھیلی پڑگئی ہے۔ مہیب، خوفناک مستقبل کے خوف سے ہم لرزے جاتے ہیں۔ صورت حال کی اس سنگینی کا ادراک اب بڑی حد تک عام ہوتا جارہا ہے۔ مسلمانوں کے علاوہ دوسری تہذیبوں میں پائی جانے والی سعید روحیں بھی اس خیال کا برملا اظہار کررہی ہیں کہ پیغمبروں کے ورثے سے مکمل غفلت اور وحی ربانی سے ہماری مزید بے نیازی کی اب کچھ زیادہ گنجائش نہیں۔ دنیا کو موجودہ بحران سے نجات دلانے کے لئے مختلف مذاہب کے علماء ومفکرین گاہے بہ گاہے مشترکہ جدوجہد کی آواز بھی بلند کررہے ہیں۔ امت مسلمہ کی خودساختہ معزولی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اس بحرانِ عظیم کی ماہیت کا صحیح اندازہ البتہ ہمارے یہاں ابھی تک عام نہیں ہوا ہے۔ ہم آج بھی خیر امت کا ورد کرنے اور اپنے اردگرد تلخ حقائق سے آنکھیں بند کئے رکھنے میں عافیت سمجھتے ہیں۔

ایک ایسی صورت حال میں جب اقوامِ عالم میں کسی اخلاقی، مذہبی اور الوہی ہدایت کی ضرورت کا احساس شدید ہو چلا ہو اور جب لوگ بلاتکلف اس ضرورت کا اظہار کررہے ہوں کہ دنیا کو موجودہ بے سمتی سے نجات دلانے کے لئے تمام ہی تہذیبوں میں پائی جانے والی سعید روحیں مشترکہ فکر وعمل کی بناء ڈالیں، آخری وحی کے حاملین کی ذمہ داری پہلے سے کہیں دوچند ہوگئی ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وحی کی جگمگاتی روشنی سے دنیا کو روشناس کون کرائے؟ آخر کون ہے جو قرآن مجید کو انسانی افکار والتباسات کی دھند سے بے نقاب کرسکے؟ گویا فی زمانہ کارِ نبوت کا فریضہ انجام دے تو کون؟

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ طبقۂ علماء کو صورت حال کی سنگینی کا یا تو اندازہ نہیں یا پھر وہ صدیوں سے حساس اجتماعی امور پر خاموشی اختیار کئے رکھنے کو ہی اپنا وطیرہ سمجھ بیٹھے ہیں۔ قدیم فقہی دائرۂ فکر کے اسیر ہونے کی وجہ سے بھی ان سے اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اولاً وحی کو راست غور وفکر کا محور بنانے کی دعوت دے سکیں گے اور یہ کہ ان کی یہ دعوت دوسرے فقہی خیموں

سے وابستہ علماء کے لئے قابل قبول بھی ہوگی یا نہیں۔ پھر یہ کہ تاریخ کے موجودہ انحراف کی درستگی کے لئے طبقۂ علماء پر مکمل انحصار گویا قرآن مجید کی اس صدائے انقلاب کی نفی ہوگی جس میں اس نے احبار و رہبان کے کسی طبقہ کی سخت مخالفت کی ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فریضہ بتایا ہے کہ وہ ﴿یضع عنهم اصرهم والاغلال التی کانت علیهم﴾ (الأعراف:۱۵۷)۔ تشریح و تعبیر کا حق جب کسی مخصوص طبقہ کا اجارہ نہیں تو پھر صرف کسی ایسے طبقے کو کارِ نبوت کا سزاوار سمجھنا بھی مزید خوش گمانیوں کو جنم دے گا۔ بلکہ سچ پوچھئے تو آج طبقۂ علماء کے مقابلے میں عام سلیم الطبع انسان قرآن سے راست اکتساب کے لئے کہیں زیادہ موزوں ہے کہ اس کا ذہن قدماء کی تفسیر و تعبیر کے تحفظات سے یکسر آزاد ہے۔ قرآن کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ ﴿هدی للمتقین﴾ ہے جس سے ہر خاص و عام اکتسابِ فیض کرسکتا ہے۔ یہ صرف مسلمانوں کی مذہبی کتاب نہیں بلکہ عالم انسانیت کا اجتماعی سرمایہ ہے۔ کسی ایسی کتاب ہدایت کو کسی طبقہ مخصوص کی تشریح و تعبیر کا مرہون منت نہیں قرار دیا جاسکتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آخری وحی کے حاملین ہر قسم کے ذہنی تحفظ سے اوپر اٹھ کر اس کتابِ ہدایت کو اقوامِ عالم کے لئے غور و فکر کا مشترکہ ایجنڈا بنائیں۔ بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جس کتاب سے پوری انسانی تاریخ کا مستقبل وابستہ ہو اس کی حتمی تشریح و تعبیر کا حق انسانوں کے ہی ایک طبقہ کو سونپ دیا جائے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم قرآن پر قاضی بننے یا خود کو religious authority سمجھنے کے بجائے قرآن کو بلا کسی پس و پیش قاضیٔ برحق کی حیثیت سے قبول کرلیں۔ گویا قرآن مجید ہماری رہنمائی میں نہ چلے بلکہ ہم اس کی رہنمائی کے آگے پوری طرح سر جھکا دیں۔

مسلمانوں پر ہی کیا موقوف وہ تمام لوگ جو خود کو الٰہ واحد کا پرستار سمجھتے ہیں، ان کا تعلق خواہ کسی قوم یا تہذیب سے ہو، وہ بھی اگر کسی تعصب کے زیرِ اثر قرآن مجید کو مسلمانوں کی کتاب سمجھ کر اس سے بے نیازی برتتے ہیں تو ایسا سمجھنا انسانیت کے ایک عظیم ورثے کی نفی ہوگی اور خود ان مذاہب کی بنیادی روح کی بھی جس کے وہ خود کو امین سمجھتے ہیں۔ ہم اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلام تمام انبیاء کا دین ہے۔ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ، اسحٰقؑ و یعقوبؑ، موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور دیگر انبیائے کرام کے تمام سلسلے اسی خدائے واحد کی بندگی کی دعوت دیتے رہے ہیں جس کی بنیاد پر آج بھی وحدتِ آدمیت کی تشکیل کا خواب ممکن ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کو مسلمانوں کی قومی شناخت کے بجائے عبودیت کے رویے کے طور پر دیکھا جائے۔ اللہ کو یہ ہرگز مطلوب نہیں کہ اس کے بندے خود اس کے دین کی بنیاد پر باہم منتشر اور متحارب ہوجائیں بلکہ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ توحید کی قوت پوری انسانیت کو ایک ایسی نظریاتی وحدت میں پرو دے جہاں تمام جھوٹی شناختیں اپنا اعتبار کھو دیں۔ موجودہ دنیا میں اسلام کی واپسی کسی مخصوص قوم کے غلبہ پر ہرگز منتج نہ ہوگی بلکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حق و باطل کے معرکے میں دنیا کے تمام سپرد کردہ نفوس، خواہ وہ کسی بھی تہذیب میں پائے جاتے ہوں، اپنے اندرون میں فتح و کامرانی کی یکساں طمانیت محسوس کریں۔

اسلام کے اس آفاقی پیغام کو بروئے کار لائے بغیر دنیا کی بے سمتی کا ازالہ نہیں ہوسکتا۔ نہ ہی یہ ممکن ہے کہ وحی سے بے نیاز ہو کر اللہ واحد کے سچے پرستار طمانیت سے سرشار ہوسکیں۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ تمام ہی انبیائے کرام پر بھیجی گئی وحی انسانیت کا اجتماعی سرمایہ ہے۔ ہم جو خدائے واحد کے آگے سرتسلیم خم کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں، کسی بھی آسمانی کتاب یا کسی بھی نبی کی تکذیب کی جرأت نہیں کرسکتے اور نہ ہی ہمارے لئے یہ ممکن ہے کہ خدا کے اس آخری آفاقی پیغام کو از سرنو عام کرنے میں دیگر تہذیب کے نفوس کو اس میں شرکت سے روکے رکھیں۔

'انٹرنیشنل کاؤنسل آن اسلام' مسلمانوں کے علاوہ دیگر انبیاء کے متبعین کو بھی ﴿کلمۃٌ سواء﴾ کی بنیاد پر فکر وعمل کے لئے میدان فراہم کرے گا۔ امید ہے آپ ہر طرح کے ذہنی تحفظ سے بالاتر ہوکر انسانیت کی عمومی فلاح کی خاطر، دنیا کو موجودہ بے سمتی سے نجات دلانے کے لئے، ہماری اس دعوت کو قبول فرمائیں گے۔ دنیا بھر سے چوٹی کے علماء و مفکرین اور مختلف میدانوں کے رہنماؤں کو اس فورم میں شرکت کی دعوت دی جارہی ہے تاکہ عالمی بحران کے ازالے کے لئے کسی واقعی منصوبہ بند عالمی سطح کی کوشش کا مخلصانہ آغاز ہوسکے۔ کاؤنسل گاہے بہ گاہے اپنے اجلاس منعقد کرے گی جس کا مقصد ﴿فاستبقوا الخیرات﴾ کی فضا کو عام کرنا ہوگا۔

دعا ہے انسانی تاریخ کے بحران کو درست کرنے میں اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائے۔